کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، اور اس کا آغاز مولانا ظفر علی خاں کی قید فرنگ سے کیا ہے، اس سے پہلے وہ مولانا مرحوم کے حالات و سوانح اور افکار و خیالات پر ایک دلچسپ کتاب لکھ چکے ہیں، اس کتاب میں مصنف نے مولانا کے عہد اسیری کی حکایت کچھ اپنی، کچھ ان کی، کچھ معتبر راویوں کی زبانی اور کچھ ان کے منظوم کلام کی مدد سے بیان کی ہے، اگو اس میں مولانا کی اسارتی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے، مگر اس سے ان کی سیرت و شخصیت اور کمالات کے بعض رخوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے، اور جنگ آزادی کے بعض نقوش بھی اجاگر ہوتے ہیں، جناب شورش اور مولانا ظفر علی خاں میں بعض باتیں مشترک ہیں، اس لیے یہ کتاب ظفر علی خاں کی کہانی ان کے متنبی کی زبانی ہے اور اس میں مصنف کی دلکش انشاء کی تمام خوبیاں موجود ہیں،

مثالی خواتین ۔ مرتبہ جناب یونس صاحب ندوی نگرامی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰ - قیمت ۵۰ نئے پیسے،
پتہ: مکتبہ طیبہ سی ۲۰/۲۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ۔

ہونہار مؤلف نے اس کتابچہ میں بعض صحابیات اور دوسری نیک بخت خواتین کے خشیت الٰہی، اتباع سنت، ذوق عبادت اور دنیا سے بے رغبتی اور دین سے رغبت و دلچسپی کے موثر اور سبق آموز واقعات سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں لکھے ہیں، مصنف اس طرح کے ہلکے پھلکے کئی مفید کتابچے لکھ چکے ہیں، اس کتابچہ کا مطالعہ مسلم خواتین کے لئے مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۱ ۔ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۸ء ۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

ہم کو ادارۂ تحقیقات اسلامی پاکستان سے بڑی توقعات تھیں کہ وہ حکومت کی امداد و سرپرستی میں دینی علوم و شرائع کی مفید خدمت انجام دے گا، مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر محققانہ کتابیں شائع کریگا، اس کو بیرونی آمیزش سے پاک کرکے اصلی شکل میں پیش کریگا، اسکے معترضین کا محققانہ جواب دے گا، کتاب و سنت کی روشنی میں نئے مسائل کا حل نکالے گا، فقہ جدید کی بنیاد ڈالے گا، مگر اسکی تحقیقات کے جو نمونے ابتک نظر آئے ہیں ان کا بڑا حصہ مستشرقین کی صدائے بازگشت اور ان کا مقصد اسلامی احکام و قوانین کو مغربی قالب میں ڈھالنا ہے، اس ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمن کا قدم اس میں سب سے آگے ہے، ان کا انداز فکر سراسر مغربی ہے، ان کے اجتہادات محض فقہی مسائل تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام کی اساس کتاب و سنت اور وحی و الہام پر بھی حملے کرنا شروع کر دیا ہے، جس کے نمونے اُن کے مضامین اور تصانیف میں نظر آتے ہیں، ادارہ کے رسالے فکر و نظر میں بعض اچھے مضامین بھی نکلتے ہیں، مگر اس کا اصلی مقصد ایک ایسے اسلام کی تشکیل ہے جس کا نام تو اسلام ہو مگر اس کے سارے خط و خال مغرب کا چربہ ہوں اور حیرت یہ ہے کہ یہ "خدمت اسلام" ایک اسلامی حکومت کی سرپرستی میں انجام پا رہی ہے،

اس ادارے میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی دینی اور مغربی دونوں علوم پر پوری نظر ہے اور وہ مستشرقین کے پُر فریب طریقۂ تحقیق سے بھی واقف ہیں، اس لیے ان کے اجتہادات سے دین سے ناواقف لوگوں کے دھوکے میں آجانے کا پورا اندیشہ ہے، پاکستان میں ایسے صاحب علم و نظر علما کی کمی نہیں جو انکے اجتہادات

کی حقیقت ظاہر کر سکتے ہیں لیکن یہ جواب علمی و تحقیقی ہونا چاہیے محض مخالفت اور طنز و استہزا سے کام نہیں چلے گا، ہماری نظر سے پاکستان کے جو دینی رسالے گذرتے ہیں ان میں بینات مستقل اس فریضہ کو انجام دے رہا ہے بعض دوسرے رسالوں میں بھی کبھی کبھی کوئی مضمون نکل جاتا ہے، ضرورت ہے کہ دوسرے دینی رسالے اور دینی جماعتوں کے اصحاب علم و قلم بھی اس فرض کو محسوس کریں، اس زمانہ میں جو جماعتیں بھی کسی حیثیت سے دین کی خدمت انجام دے رہی ہیں سب قابل قدر ہیں، ان میں فروعی اختلافات بھی ہو سکتے ہیں اور فروعات میں اختلاف عہد صحابہ سے لیکر ابتک کس دور میں نہیں رہا لیکن یہ سب اصول میں متحد تھے، اسلیے انھوں نے اختلاف کو اسکے دائرہ تک محدود رکھا، انکو ایک دوسرے کی مخالفت اور دشمنی کا ذریعہ نہیں بنایا اور باطل کے مقابلہ میں سب متحد رہے، اس لیے اس دور کی دینی جماعتوں کا اختلاف بھی مخالفت اور عناد کی حد تک نہ پہنچنا چاہیے، اور ان کا زور قلم ایک دوسرے کے مقابلہ میں صرف ہونے کے بجائے اصل فتنوں کے سد باب میں صرف ہونا چاہیے، ورنہ ان جماعتوں کو نقصان پہنچنے کے ساتھ دین کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ابھی گذشتہ مہینہ مغربی پاکستان میں اسلامی ملکوں کی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مختلف اسلامی ملکوں کے صاحب علم نمایندے شریک ہوئے، اور مختلف اسلامی اور نئے پیدا شدہ مسائل پر بحث ہوئی، کانفرنس میں دور جدید کے مجتہدین اور متجددین بھی شریک تھے، اور دینی فکر کے ترجمان بھی، اس لیے دونوں رنگ کی تقریریں ہوئیں، اور مقالے پڑھے گئے، مگر مجموعی حیثیت سے دینی فکر رکھنے والوں کا اثر غالب رہا، اور نہ صرف پرانے علما بلکہ بعض جدید تعلیم یافتہ فضلا نے بھی خالص دینی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی اور متجددین کو آڑے ہاتھوں لیا، اس قسم کی کانفرنسیں مختلف حیثیتوں سے نہایت مفید ہیں، ان سے اسلامی ملکوں کے درمیان ربط و ضبط پیدا ہوتا ہے، انکے مشترک مسائل

تبادلۂ خیالات اور غور و فکر کا موقع ملتا اور جدید پیدا شدہ مسائل کے حل میں مدد ملتی ہے۔

کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ پر اس سے پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں، اسکی بعض سفارشوں سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ کل اقلیتوں کے آزاد مدارس و مکاتب کا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے، دوسری اقلیتوں کے مدارس پر خواہ اسکا اثر پڑے یا نہ پڑے لیکن مسلمانوں کے مدارس کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے، یہ سفارشیں اقلیتوں کے دستوری حقوق کے سراسر خلاف ہیں، اور اس مسئلہ میں بمبئی ہائیکورٹ کا فیصلہ اقلیتوں کے حق میں ہو چکا ہے، اسلیے سب اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو اسکی پوری کوشش کرنی چاہئے کہ ان سفارشوں کو جنکا اثر آزاد مدارس پر پڑتا ہے حکومت منظور نہ کرے، دینی تعلیمی کونسل نے اس کے لیے کوشش شروع کر دی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس کی تائید میں آواز بلند کریں۔

دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے بڑے اہتمام سے ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی ترتیب اور نہایت خوبصورت ٹائپ میں اسکی طباعت و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے، اس سے پہلے وہ انکے عربی اور فارسی دیوان شائع کر چکا ہے، اب اس نے انکی اہم تصنیف "دلائل القرآن" شائع کی ہے، اس کتاب میں مصنف علام نے اپنے خاص موضوع کلام مجید کی آیات اور سورتوں میں ربط و نظم کے دلائل، اصول اور اس پر غور و فکر کے طریقے بتائے ہیں، یہ کتاب بھی انکی دوسری تصنیفات کی طرح کلام مجید میں ان کی دقت نظر دقیقہ سنجی، نکتہ رسی اور ان سے متعلق فوائد و نکات پر مشتمل ہے، انکی ایک دوسری کتاب اصول التاویل بھی زیر طبع ہے، یہ دونوں کتابیں کلام مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

سیرۃ النبی کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے، ابھی اسکی پانچویں جلد جو عبادات پر مشتمل ہے پشتو میں ترجمہ ہوا ہے، مترجم کا نام عزیز الرحمن سیفی ہے، عمدہ کاغذ پر خوبصورت خط میں چھپی ہے۔

مقالات

حیات سلیمانی ایک صفحہ

حجاز کے وفود کی صدارت

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۳)

حجاز میں شریف حسین کی حکومت کے قیام کے بعد جو انقلاب اور سلطان عبدالعزیز کے حجاز پر قبضہ کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنا پورا فرض انجام دیا، ان کی مختلف جماعتوں نے حجاز کی حکومت کی تشکیل اور نظام میں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے اپنے وفد بھیجے، حضرت سید صاحبؒ نے مجلس خلافت کے وفود کی دو مرتبہ قیادت فرمائی اور مسلمانوں کی ترجمانی کا پورا حق ادا کیا، یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں، اس لیے لندن کے وفد خلافت کے بعد اسکے حالات بھی ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ 'م'

حجاز میں انقلاب ترکی حکومت سے بغاوت اور اتحادیوں کی امداد کے صلہ میں جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد شریف حسین کو حجاز، ان کے بڑے لڑکے امیر فیصل کو عراق اور منجھلے لڑکے امیر عبد اللہ کو شرق اردن کی حکومت ملی تھی، مگر شریف حسین کی غداری اور ملت فروشی سے ساری دنیائے اسلام

ان سے متنفر اور بیزار تھی، خود اہل حجاز بھی دل سے اُن کے خلاف تھے، صرف قوت کے زور سے دبے ہوئے تھے، ان حالات نے چند ہی سال میں حجاز میں انقلاب کے اسباب فراہم کر دیے، جنگ عظیم کے اثرات نے ہر ملک کی اقتصادی حالت بگاڑ دی تھی، حجاز میں اس کا بہت زیادہ اثر تھا، ترکی حکومت جو لاکھوں پونڈ سالانہ حرمین پر صرف کرتی تھی ختم ہو چکی تھی، دوران جنگ میں امن کی بد امنی اور جنگ کے خاتمہ کے بعد حکومت حجاز کی بدنظمی اور اس کے غیر معمولی ٹیکسوں سے حج جو اہل حجاز کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا تقریباً بند ہو گیا تھا جس سے حجاز کی مالی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی، حکومت بھی دوالیہ ہو رہی تھی، شریف حسین نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جائز و ناجائز ہر طریقے سے روپیہ حاصل کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے ان کے خلاف اور بھی برہمی پیدا ہو گئی،

حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا قبضہ

نجد کے حکمراں خاندان آل سعود اور اشراف مکہ میں پرانی عداوت چلی آ رہی تھی، شریف حسین کی ملت فروشی نے اس کو اور بڑھا دیا تھا، اس کے فرمانروا سلطان عبدالعزیز آل سعود نے شریف حسین کے مخالف حالات سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۲۴ء میں حجاز پر حملہ کر دیا، سلطان کی فوجی طاقت مضبوط تھی، اہل حجاز شریف حسین کے مظالم سے نالاں تھے، سلطان کے تعلقات انگریزوں سے بھی اچھے تھے، اور اب ان کو شریف حسین کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے انھوں نے شریف کی کوئی خاص مدد نہ کی، اور سلطان عبدالعزیز نے طائف اور مکہ پر قبضہ کر لیا، شریف حسین نے بھاگ کر جدہ میں پناہ لی اور اپنے لڑکے شریف علی کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گئے۔

مسلمانوں میں بے چینی

ترکی حکومت کے خاتمہ اور اس کے نتائج سے دنیائے اسلام کے مسلمان پہلے ہی مضطرب تھے، حجاز پر سلطان کے قبضہ کے بعد خبر مشہور ہو گئی کہ نجدی فوجوں نے طائف میں قتل عام کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا روضہ مسمار کر دیا، اہل مکہ پر بھی مظالم کیے ہیں، اور

یہاں کے مشاہد کو ان کے ہاتھوں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے، نجدیوں کے بعض عقائد سے عام مسلمان پہلے سے بدگمان تھے، اس لیے اس خبر سے اور تشویش بڑھ گئی اور جمعیۃ الخلافت نے حرمین کے تحفظ، اُن کے احترام اور قیام امن کے لیے سلطان عبدالعزیز، شریف علی جمعیۃ الاقوام حکومت برطانیہ اور دوسری طاقتوں کو تار دیے۔

شریف علی نے جواب دیا کہ وہ خود حجاز میں امن و امان چاہتے ہیں اور محض حرم کو خونریزی سے بچانے کے لیے وہ مکہ سے جدہ چلے آئے ہیں، اور یہ خواہش کی کہ کوئی شخص درمیان میں پڑ کر دونوں میں صلح کرا دے، لیکن سلطان عبدالعزیز کا مقصد شریف حسین اور ان کی ذریت سے حجاز کو پاک کرنا تھا، انھوں نے جواب دیا کہ میرا مقصد مکہ معظمہ پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ وہاں کے باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت ٹیکسوں سے نجات دلانا اور مہبط وحی و الہام میں شریعت کا احیاء اور احکام الٰہی کا نفاذ ہے، اور یقین دلایا کہ مکہ میں شریعت کے علاوہ کسی بادشاہ کی حکومت نہ ہوگی، سب کو شریعت کی پابندی کرنا ہوگی، مکہ معظمہ سے جملہ مسلمانان عالم کا تعلق ہے، اس لیے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے مطابق طے ہوگی، ہم ان سب کی نمایندہ کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد کریں گے اور ہر اس مسئلہ پر ان کی رائے لیجائے گی جس سے بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریکوں سے محفوظ ہو جائے اور حجاج کو حرمین کے سفر میں امن و عافیت نصیب ہو، حجاز ہر مسلمان اور ہر نیک بندے کے لیے کھلا رہے گا اور ہم اپنے امکان بھر اس کے راستوں کی حفاظت کریں گے، اس کا بھی انھوں نے یقین دلایا کہ حجاز کے مقابر اور آثار و مشاہد کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے گا۔

وفد خلافت کی کوشش اور اس میں ناکامی

خلافت کمیٹی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ حجاز میں دنیائے اسلام کے مشورے سے جمہوری اور شرعی حکومت قائم کیجائے جس سے شریف حسین اور انکے

خاندان کا کوئی تعلق نہ ہو، اور اس مقصد کے لیے جلد سے جلد مکہ میں اسلامی دنیا کی ایک نمایندہ
کانفرنس منعقد کیجائے، چنانچہ ان مسائل پر گفتگو اور حجاز کے حالات کی تحقیقات کے لیے
اس نے ۱۹۲۴ء میں ایک وفد سید صاحب کی قیادت میں حجاز بھیجا، اس کے ارکان مولانا
عبدالماجد صاحب بدایونی اور مولانا عبدالقادر صاحب قصوری تھے۔

شریف علی جدہ ہی میں تھے، اس لیے پہلے ان سے گفتگو ہوئی، سید صاحب نے ان کے سامنے
جمعیۃ خلافت کی تجویزیں پیش کیں، اور مختلف ملاقاتوں میں ان سے اور ان کے وزراء سے
گفتگو ہوتی رہی، مگر شریف علی ان تجویزوں کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے، ان کا عذر تھا
کہ حجاز میں جمہوری حکومت ناممکن العمل ہے، اور اسلامی ملکوں کے نمایندوں کی کانفرنس
بے سود بھی ہے اور ناممکن العمل بھی، البتہ وہ ایسی دستوری حکومت کی تجویز کو مان سکتے ہیں،
جس کے بادشاہ وہ خود ہوں، جو حجاز کے حالات کے لیے ضروری ہے، البتہ مذہبی معاملات
کی حد تک وہ اسلامی ملکوں کے نمائندوں کو مشورے میں شریک کر سکتے ہیں، اس کے
علاوہ اور کوئی شکل ان کے لیے قابل قبول نہیں، یہ شرط ایسی تھی کہ اس کو خلافت کمیٹی
اور سلطان عبدالعزیز دونوں میں سے ایک بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا، شریف علی سے
گفتگو کے بعد وفد نے سلطان سے گفتگو کرنے کے لیے مکہ جانے کا ارادہ کیا، مگر شریف علی نے
اس کی اجازت نہیں دی اور کہا پہلے جمعیۃ الخلافت اور سلطان دونوں ان کو بادشاہ
مان لیں، اس وقت اس کی اجازت دیجا سکتی ہے کہ وفد مکہ جاکر صلح کی گفتگو کرے، سید صاحب
نے رئیس الوزراء کو خط لکھا جس میں اس مطالبہ کی دشواریوں کو سمجھایا اور یہ بھی لکھا کہ ان مشکلات
کا حل سلطان سے گفتگو کے بعد ہی نکل سکتا ہے، لیکن امیر علی اپنے مطالبہ پر اڑے رہے، اس لیے
وفد کی ساری جدوجہد بے کار گئی اور وہ دو مہینہ قیام کے بعد ہندوستان واپس آگیا۔

سید صاحب کا سفر مصر

سید صاحب اہل مصر سے حجاز کے معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے مصر چلے گئے،
الشیخ الازہر اور مصر کے دوسرے ارکان و عمائد سے مل کر ان کو اپنا ہم خیال بنایا، جو نہ صرف
ہندوستان بلکہ مصر میں بھی ان کا بڑا کارنامہ سمجھا گیا، اور مصر کے اخبارات نے جلی سرخیوں سے
اس خبر کو شائع کیا۔

حجاز کے حالات پر تاثرات

ہندوستان کے مسلمان تو حجاز کے مستقبل کے لیے بیقرار تھے اور ان میں نجد و
حجاز کے مسئلہ پر خانہ جنگی برپا تھی لیکن خود اہل حجاز کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے معاملات میں
کسی بیرونی کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے، حضرت سید صاحب مارچ ۱۹۲۵ء کے شذرات
میں تحریر فرماتے ہیں:

"گذشتہ ملکی تحریک[1] سرد پڑ جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں پھر فرقہ آرائیوں اور ہنگامہ
زائیوں کی گرم بازاری ہے، خصوصاً مسلمانوں کے لیے تو گویا نجد و حجاز کی جنگ خود ہندوستان
میں ہو رہی ہے، وہاں اگر تیغ و تفنگ کی لڑائی ہے تو یہاں حلق و زبان اور دست و قلم
کی معرکہ آرائیاں ہیں، وہاں اگر یہ مسئلہ سیاسی اور وطنی حیثیت رکھتا ہے تو یہاں دین و
مذہب کی، مگر اے کاش ہماری قوم کو یہ معلوم ہوسکتا کہ ہم جنگی تائید میں مذہبی دلیلوں اور
حجتوں سے جو جذبات ابھار رہے ہیں، ان کی نگاہ میں ان کی کیا وقعت ہے، حکومت
حجاز کی دلیل اگر مذہب کے ستون پر قائم ہوتی تو کون مسلمان ان کی اس دلیل کو نہ تسلیم کرتا،
مگر ہندوستان میں اس کے ہمدرد جانتے ہیں کہ ہم عجمیوں کے مقابلہ میں ان کا دعویٰ کیا ہے؟
حجاز حجازیوں کا ہے اور غیر حجازیوں کو اس میں دخل دینے کی حاجت نہیں۔" بریدالحجاز
جو حکومت حجاز کا آرگن ہے اس کا سرنامہ حب الوطن من الایمان ہے، اگر یہ حدیث صحیح
ہے تو ان کے ہندوستانی ہمدرد بھی اس کو صحیح سمجھتے ہیں؟

---

[1] تحریک ترک موالات

پھر اس جذبہ پر تبصرہ فرماتے ہیں:

"اللہ اکبر، وہ دین جو دنیا میں قومی عصبیتوں، نسلی امتیازوں اور ملکی تفریقوں کو مٹانے آیا تھا، اب اس کے پیرو خود ان عصبیتوں، امتیازوں اور تفریقوں کو ذریعۂ نجات اور طریق حیات جانتے ہیں، اور ہماری شامتِ اعمال اب اس حد کو پہنچی ہے کہ قلب اسلام (حجاز) تک یہ عقیدہ سرایت کر چکا ہے اور اس پر فخر ہے لوگ چاہتے ہیں کہ سرزمین عرب کو یورپ کی سیاسی غلامی سے آزاد کیا جائے، لیکن ہم یہ خیال لیکر لوٹے ہیں کہ اس کو یورپ کی دماغی اور ذہنی غلامی سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہے۔ طوطوں کی طرح بعض وزرائے حجاز کی زبانوں سے یورپ کے ان پڑھائے ہوئے سبقوں کو سننا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس درجہ سوہانِ روح کا باعث ہوتا تھا، ترکوں کی وطن پرستی کا افسانہ تو پرانا ہو چکا لیکن خبر لیجیے کہ اگر یہ بدمذہبی ہے تو اس بدمذہبی کی بلا کہاں پہنچ چکی۔

اے پسر از پردۂ یثرب بجواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

وہ سرزمین حجاز جہاں کا ذرہ ذرہ کبھی علم کا آفتاب تھا، جہاں دنیاے اسلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم کھنچے چلے آتے تھے، جہاں کی مسجد حرم اور مسجد نبوی کے در و دیوار سے کبھی قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے معمور تھے آج درس کی وہ مسندیں خالی پڑی ہیں، وہ پاک چشمے خشک پڑے ہیں، فتن و حوادث کے بادِ صرصر نے ان مرغانِ حرم کے آشیانے بکھیر دیے، رسول عربی کے شہر (مدینہ طیبہ) کی آبادی سو ہزار سے گھٹ کر ۱۰ ہزار رہ گئی، مسلمانانِ ہند سوچیں کہ جنگِ عظیم

کے کن اثرات نے ان کے گھروں کو ویران کیا ہے؟

اے شہ نماند خلوتیانِ حجاز را
دیدی تطاولِ خمِ زلفِ دراز را

دوسرے وفد حجاز کی قیادت

اگست ۱۹۲۵ء میں رؤیٹر کی خبر سے معلوم ہوا کہ نجدیوں نے مدینہ طیبہ پر حملہ کر دیا اور گولہ باری سے اہل مدینہ کو بڑا نقصان پہنچا، حضرت حمزہؓ کی مسجد شہید کر دی گئی؛ نجدیوں کے عقیدے سے ہندوستان کے مسلمان پہلے سے بدگمان تھے، اس لیے اس خبر سے ان میں بڑا اضطراب پیدا ہو گیا۔ خلافت کمیٹی نے حالات معلوم کرنے کے لیے سلطان ابن سعود کو تار دیا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ مقابر اور آثار و مشاہد کو کوئی صدمہ نہ پہنچنے پائے گا، ان کا مقصد حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ حرم کی تطہیر اور حجاز کے باشندوں کو شریف حسین کے مظالم سے نجات دلانا ہے۔ حجاز پر قبضہ کے بعد دنیائے اسلام کے مشورے سے وہ حکومت کا نظام بنائیں گے، اور اس غرض کے لیے انھوں نے دعوت نامہ بھی جاری کر دیا ہے، اس لیے جمعیۃ خلافت نے پھر ایک وفد سید صاحب کی قیادت میں مرتب کیا، اس کے ارکان مولانا محمد علی، مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسین، مولانا عبد الماجد بدایونی، اور شعیب قریشی تھے، مگر کچھ ایسی صورت پیش آگئی کہ سید صاحب اور دو ارکان مولانا عبد الماجد بدایونی اور سید خورشید حسین نہ جا سکے، اس وفد نے مکہ جا کر سلطان سے گفتگو اور حجاز کے حالات اور وہاں کے مقابر و مشاہد کی تحقیقات کی، مگر مولانا ظفر علی خاں نجدیوں کے ہمنوا ہو گئے، جس سے ارکان وفد میں اختلاف پیدا ہو گیا، یہ وفد ابھی حجاز ہی میں تھا کہ سلطان عبد العزیز نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا،

نجدیوں کے بارے میں اختلاف

ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت پہلے سے نجدیوں کے عقائد کے خلاف تھی، اس لیے روضۂ نبویؐ پر گولہ باری اور دوسرے آثار و مشاہد کے انہدام کی خبر نے

ہندوستان میں آگ لگا دی، اور سلطان عبد العزیز کی مخالفت اتنی بڑھی کہ ایک جماعت ان کے مقابلہ میں شریف حسین جیسے ملت فروش کی حامی بن گئی، بریلوی، رضاخانی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین اس میں پیش پیش تھے، ان کی مخالفت زیادہ موثر نہ ہوتی، مگر صورت یہ پیش آئی کہ حرمین کے مقابر اور آثار و مشاہد کے انہدام کی مبالغہ آمیز خبروں نے بہت سے سنجیدہ اور متوازن خیالات کے لوگوں کو بھی سلطان کا مخالف بنا دیا، ان میں مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا، اس لیے سلطان کے مخالفین کا دائرہ بھی بہت وسیع ہوگیا، اور اس اختلاف نے بڑھ کر جنگ کی صورت اختیار کرلی، اور اس کے دو محاذ بن گئے، ایک کے لیڈر مولانا عبد الباری مرحوم تھے، دوسرے کے مولانا محمد علی، اور ان کا مرکز لکھنؤ تھا،

مولانا محمد علی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ شریف حسین اور ان کی ذریت سے جو نقصان پہنچ چکا ہے، حرمین کی جو بے حرمتی اور مسلمانوں کی جو رسوائی ہو چکی ہے اس کی تلافی اور آئندہ جو خطرات درپیش ہیں اُن کا انسداد سلطان ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، حرمین کے آثار و مشاہد کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کی تعمیر و تجدید کے لیے وہ تیار ہیں، اور یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے گا، اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ حجاز پر قبضہ کے بعد وہاں دنیائے اسلام کے مشورے سے جمہوری حکومت قائم کی جائے گی، اس لیے ان کو ان وعدوں کے ایفاء کا موقع دینا چاہیے۔

لیکن جو لوگ نجدیوں کے خلاف تھے اُن کو سلطان کے وعدوں پر کوئی اعتبار نہ تھا، اور وہ کسی حالت میں ان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، مولانا محمد علی کی پوزیشن اس اختلاف میں بڑی نازک تھی، ان کو تنہا عام مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اپنے مرشد مولانا عبد الباریؒ کا مقابلہ بھی کرنا تھا، انھوں نے اس کو بچانے کی کوشش کی مگر دراندازوں نے اس میں کامیابی نہ ہونے دی، اور مولانا محمد علی اپنے پیر و مرشد کی مخالفت پر مجبور ہو گئے، اور لکھنؤ دونوں جماعتوں کا اکھاڑہ

بن گیا، اس سلسلہ میں بڑے ہنگامے پیش آئے، لیکن ان کو ہمارے موضوع سے تعلق نہیں، اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

موتمر اسلامی کا انعقاد اور وفد حجاز کی قیادت

اس دوران میں سلطان عبد العزیز نے مدینہ طیبہ پر بھی قبضہ کر لیا، اور ۱۹۲۵ء میں پورا حجاز ان کے قبضہ میں آگیا، حجاز پر قبضہ کے بعد وہ تمام وعدے جو انھوں نے مسلمانوں سے لیے تھے، فراموش کر دیے، اور خواہ حالات کی مجبوری کی بنا پر یا محض حکومت کی ہوس میں، اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، مولانا محمد علی مرحوم نے جس شدت سے سلطان کی حمایت کی تھی، بادشاہت کے اعلان کے بعد اسی شدت سے اس کی مخالفت کی، سلطان جس موتمر کا دعوت نامہ جاری کر چکے تھے اس کو تو منسوخ نہیں کیا، لیکن اس کی نوعیت بدل دی، پہلا دعوت نامہ جمہوری حکومت کے قیام اور اس کے نظام پر صلاح و مشورے کے لیے تھا، دوسرا دعوت نامہ جو مارچ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا وہ صرف خطرات سے حرمین کی حفاظت، اہل حرمین کی خدمت اور حجاج کے آرام و سہولت کے وسائل پر غور و فکر اور اس قسم کے دوسرے چھوٹے چھوٹے اصلاحی امور پر مشتمل تھا، نظام حکومت کی تشکیل سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، موتمر کی تاریخ جون ۱۹۲۶ء تھی، ہندوستان میں یہ دعوت نامہ تین جماعتوں کے نام آیا تھا، جمعیۃ خلافت، جمعیۃ العلماء، اور اہل حدیث کانفرنس، ان تینوں نے اپنے اپنے وفد بھیجے، جمعیۃ علماء کے رئیس وفد مولانا کفایت اللہ صاحب اور ارکان مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا عبد الحلیم صاحب تھے، جمعیۃ خلافت کے وفد کی قیادت اس مرتبہ بھی سید صاحب کے حصہ میں آئی، اس کے ارکان مولانا محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی تھے، یہ دونوں جماعتیں حجاز کی حکومت کے آئندہ نظام

[1] اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔

کے بارہ میں اپنے پرانے موقف پر تھیں، دوسرے ملکوں میں مصر، بیروت، شام، فلسطین، سوڈان، نجد، یمن، روس، ترکی، افغانستان اور جاوا کے وفد تھے،

سلطان عبد العزیز سے گفتگو جمعیۃ الخلافۃ اور جمعیۃ العلماء کے وفود مئی ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں جدہ پہنچے، یہاں پہنچنے کے ساتھ ان کو جنت البقیع اور مدینہ طیبہ کے دوسرے مزارات کے انہدام کی اطلاع ملی اسلئے دوسرے ہی دن دونوں وفد مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے، ۲۸ کو سلطان عبد العزیز نے شرف باریابی بخشا، رسمی گفتگو کے بعد مولانا شوکت علی نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ حجاز کے معاملہ میں سب سے اہم یہ ہے کہ بیرونی قوموں کو اس میں مداخلت کا موقع نہ دیا جائے، اور ان کے اثر و نفوذ سے اس کو محفوظ رکھا جائے، وہ پوری دنیائے اسلام کی دولت ہے تنہا کسی کی ملک نہیں، ممکن ہے اور چیزوں کا آپ ہم سے بہتر علم رکھتے ہوں، لیکن غیر قوموں کو ہم آپ سے بہتر جانتے ہیں، ڈیڑھ سو برس سے ہم کو ان کا تجربہ ہے، سلطان نے جواب دیا کہ میں نے اپنی حکومت کے دو اصول مقرر کئے ہیں، جو کسی حال میں نہیں بدل سکتے، ایک یہ کہ ہمارا مرجع کتاب و سنت ہوگا، دوسرے یہ کہ ہماری حکومت اجنبی مداخلت کو کسی حالت میں گوارا نہ کرے گی، مولانا محمد علی نے کہا کہ دو امور آپ کے بھی ذہن نشین رہنے چاہئیں، ایک یہ کہ ہم مشرک نہیں ہیں، اور کتاب و سنت پر ہمارا بھی ایمان ہے، دوسرے یہ کہ حجاز تمام مسلمانوں کا ہے، اس لیے ہم یہاں اجنبی نہیں ہیں، اور حجاز کی خدمت کرنا ہمارا شعار ہوگا۔

سید صاحب نے کتاب و سنت کے مسئلہ پر مفصل روشنی ڈالی، انھوں نے فرمایا کہ دنیا کا کون ایسا مسلمان ہے جو کتاب و سنت سے اعراض کرتا ہو، جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے سب اسلامی فرقے ان کو یکساں قبول کرتے ہیں، بحث جو کچھ ہے وہ اس کے معنی میں ہے، ہر فرقہ اسکا مدعی ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہے، کیا کوئی ایسا فرقہ بھی ہے جو کہتا ہو کہ ہم کتاب و سنت

سے روگرداں ہیں، اختلاف جو کچھ ہے وہ اس کی تفسیر و تاویل، احادیث کے ضعف و توثیق یا دلائل کے قوت و ضعف میں ہے، اور یہ اختلاف نیا نہیں بلکہ ہمیشہ کا ہے، اس لیے یہ مناسب نہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو دلائل کے بجائے قوت سے اپنے مسائل تسلیم کرائے، خود اہل سنت میں مختلف فرقے ہیں اور ان میں آراء و مسائل کا اختلاف بھی ہے، اس لیے یہ موقع نہیں کہ ہم موجودہ کشمکش کے زمانہ میں ان مسائل کو چھیڑیں، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ کفر کے مقابلہ میں تمام اسلامی فرقوں کو یکجا کریں، نہ کہ آپس کے اختلافات کو اور زیادہ بڑھائیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رکن وفد جمعیۃ العلماء نے فرمایا کہ تفسیر و تاویل کے اختلافات موجود ہیں، اور ان کی مثالیں دے کر بتایا کہ کن امور میں شرک کا فتویٰ دینا چاہیے اور کن امور میں نہ دینا چاہیے، سلطان نے ان سب کے جواب میں کہا کہ بہتر ہوگا کہ ان معاملات میں آپ ہمارے علماء سے گفتگو کر لیجئے، میں مفتی نہیں ہوں، بلکہ ہمارے علماء قرآن و حدیث کے مطابق جو فتویٰ دیتے ہیں ان کو نافذ کر دیتا ہوں۔

۳۰ مئی کو پھر مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی صاحب نے سلطان سے ملاقات کی، اور پوری صفائی کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کیے، مجلس خلافت کی تجویزوں کو سلطان کے سامنے پیش کر کے ان کو ان کے وعدے یاد دلائے، مولانا شوکت علی نے اتحاد اسلامی اور حرم سے دنیائے اسلام کا تعلق بتا کر کہا کہ اس وقت مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے نہ کہ اختلاف پیدا کیا جائے، آپ نے مزارات، قبوں اور مآثر کے انہدام کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے مسلمانوں میں نئے سرے سے عقائد کی جنگ شروع ہو جائے گی، ہم نے بڑی مشکلوں سے اپنے ملک سے اس خانہ جنگی کا

خاتمہ کیا ہے اور تمام مسلمانوں کو ملا کر ایک متحدہ صف قائم کی ہے، آپ کے طرز عمل سے ہماری قوت دوبارہ پراگندہ اور تمام دنیائے اسلام میں خانہ جنگی برپا ہو جائے گی، حجاز تمام دنیا کا مشترک حرم ہے، کسی اسلامی فرقہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے عقیدہ و خیال کے مطابق حرم کے آثار و مشاہد و مقابر میں ایسا تصرف کرے جو دوسرے فرقوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے، ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ مذہب اسلام کے اہم مسائل کا فیصلہ صرف نجد کے علماء کے ہاتھوں میں دے دیا جائے، مدینہ منورہ کے مقابر و مشاہد کے متعلق ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ موتمر اسلامی کے فیصلہ کے بغیر ان کے بارہ میں کوئی اقدام نہ کیا جائے گا، لیکن اس کی خلاف ورزی کی گئی، اور دنیائے اسلام کے جذبات کے خلاف ان کے استصواب کے بغیر ان کو منہدم کر دیا گیا،

سلطان نے جواب دیا، آپ نے جو کچھ کہا صحیح ہے، میں دل سے یہی چاہتا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری قوم سے واقف نہیں ہیں، ان کے متعصب قبائل نے دھمکی دی کہ ہم نے اسی لیے جہاد اور اپنا جان و مال قربان کیا تھا کہ مراسم شرک کا استیصال اور قرآن و سنت کو قائم کیا جائے، اس لیے جلد سے جلد ان قبوں اور عمارتوں کو منہدم کر دیا جائے ورنہ ہم خود ان کو گرا دیں گے، اس دھمکی کے بعد ہمارے لیے دو ہی صورتیں تھیں، یا ان کو زبردستی روکتے یا گرانے کی اجازت دیتے، پہلی صورت میں خانہ جنگی کا اندیشہ تھا، اور دوسری صورت میں فتنہ و فساد کا جس سے اہل مدینہ کو بھی مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا، اور دوسری عمارتوں کو بھی صدمہ پہنچتا، اور ان کا مطالبہ غیر شرعی بھی نہ تھا، بلکہ خدا و رسول کے حکم اور کتاب و سنت کے مطابق تھا، اس لیے میں نے قاضی القضاۃ سے خواہش کی کہ وہ خود مدینہ جا کر اس کام کو انجام دیں، جو چیز خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے اس میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد مولانا محمد علی نے سلطان کے سامنے دنیا کی حالت کا نقشہ پیش کیا، غیر مسلموں

کی طاقت اور مسلمانوں کی کمزوری دکھائی اور جو اسلامی ملک آزاد ہو چکے ہیں ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کو ظاہر کر کے کہا کہ ان حالات میں ان کی نظریں سلطان پر پڑی ہیں اور ان سے ان کو بڑی توقعات تھیں، اور وہ سلطان کو ملک الحجاز کے منصب سے کہیں زیادہ جلیل القدر منصب پر دیکھنا چاہتے تھے، سلطان اس چھوٹے منصب پر کیوں راضی ہو گئے، انھوں نے اس کو کیوں اپنا مطمح نظر بنایا اور اردو کا یہ شعر

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گوہر نہ ہوا تھا

پڑھکر کہا کہ وہ قطرہ جو صدف میں جا کر موتی ہی بننے پر قانع ہے، پیرس کی رقاصہ کے گلے کی زینت بھی بن سکتا ہے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ سلطان وہ قطرۂ آب ہوں جو ایک مسلمان کی آنکھ سے آنسو بن کر روضۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر گرایا جائے۔

اس کے بعد سید صاحب نے مقابر و آثر کے متعلق گفتگو کی اور فرمایا کہ مذہبی حیثیت سے مقابر و آثر دونوں کی حیثیتیں الگ الگ ہیں، مقابر کی تعمیر و بناء کے متعلق احادیث و فقہ میں ممانعت کے تصریحی الفاظ ملتے ہیں، گو ایک فریق ان کی تاویل کرتا ہے اور ایسا نہیں سمجھتا، تاہم اس کی ایک شرعی حیثیت ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ علمائے اسلام کے سامنے کھلے طریق سے اس مسئلہ کو پیش کر کے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے، جو یقیناً کثرت تعداد کے لحاظ سے حق کے خلاف نہ ہوگا، لیکن آثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے کوئی خاص نسبت ہے، ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا تمام دفتر خالی ہے، اس پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو ان کی صحت اسناد یا عدم صحت سے، البتہ ان آثر میں اگر جاہل مسلمان ایسے اعمال کریں جو خلاف شرع ہوں تو دوسری چیزوں کی طرح یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہاں ایسے نگراں یا پولیس کے سپاہی مقرر کرے جو زائرین

کو ان اعمال سے باز رکھیں، سلطان نے اس کے جواب میں کہا کہ میں مذہبی عالم نہیں ہوں، اس لیے اس کا جواب نہیں دے سکتا، آپ اس بارہ میں ہمارے علماء سے گفتگو کیجیے، اور اس کے لیے ایک مجلس علماء مقرر کر دی۔

مجلس العلماء کا انعقاد چنانچہ ۳۱ رمئی کو اس مجلس العلماء کا جلسہ ہوا جس میں ان سب اسلامی ملکوں کے علماء شریک ہوئے جو اس وقت مکہ میں موجود تھے، جلسہ کا آغاز سلطان کی تقریر سے ہوا، انھوں نے کتاب و سنت سے تمسک پر زور دیا، اور کہا کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت نبویؐ پر مضبوطی سے قائم رہیں، اور اپنے فرقہ وارانہ خیالات کو چھوڑ دیں، ان کے بعد علامہ رشید رضا مصری نے تقریر کی جو تمامتر اہل نجد کی ثنا و صفت پر مشتمل تھی، اسی طریقہ سے مصر، شام اور سوڈان کے علماء نے بھی سلطان کی قصیدہ خوانی کی، اس موقع پر جمعیۃ الخلافت ہی کے وفد کے ارکان نے اعلان حق کی جرأت کی، مولانا محمد علی نے اٹھ کر کہا" کہ ہم اسی کتاب و سنت کے نام پر آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ ملوکیت چھوڑ کر جمہوریت اختیار کیجیے، اور قیصر و کسریٰ کی سنت کے بجائے صدیقؓ و فاروقؓ کی سنت کو تازہ کیجیے، وفد جمعیۃ العلماء کے رکن مولانا عبد الحلیم صاحب نے اسلام کے دوسرے فرقوں کے ساتھ رواداری برتنے کی ضرورت ظاہر کی، مولانا کفایت اللہ صاحب نے اس کی تائید میں تقریر فرمائی۔ ان تقریروں نے سلطان اور قاضی القضاۃ ابن بلیہد کو بہت مشتعل کر دیا، اور انھوں نے اس کا غضب آلود جواب دیا، یہ صورت دیکھ کر سید صاحب نے رواداری پر تقریر کی اور فرمایا، ہم کو معلوم ہوا ہے کہ اہل نجد معمولی معمولی باتوں مثلاً حقہ اور سگریٹ پینے پر لوگوں کو مارتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر تشدد کرتے ہیں، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ بھی سنا گیا ہے کہ رمضان میں تین دن تک بیس رکعت تراویح پڑھی گئی، اس کے بعد حکماً سب کو

آٹھ رکعت پڑھنے پر مجبور کیا گیا، سلطان نے کہا یہ صحیح نہیں ہے، میں نے خود کئی دن تک بیس رکعت پڑھی ہے، مگر بعد میں مکہ کے دوکان دار میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم لوگ کاروباری آدمی ہیں بیس رکعت پڑھنے میں وقت زیادہ لگتا ہے اس لیے ہم کو آٹھ رکعت پڑھنے کی اجازت دیجائے اس پر ہم نے عمل کیا، عبد اللہ شیبی اور سید حسین نائب حرم وغیرہ چند غیر سرکاری اشخاص نے اس کی تصدیق کی، ان تقریروں کے بعد پہلا اجلاس ختم ہو گیا۔

سید صاحب کی تقریر دوسرا اجلاس یکم جون کو ہوا، سب سے پہلے سید صاحب نے مقابر اور مآثر کے مسئلہ پر ایک پرزور تقریر کی اور احادیث اور تاریخ و سیر کی کتابوں سے اس کا ثبوت دیا، آخر میں انھوں نے فرمایا کہ ہم مجلس خلافت کی جانب سے تین تجویزیں لیکر آئے ہیں، اول یہ کہ کتاب و سنت پر عمل کے ساتھ ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہیے جن میں خود صحابہ و تابعین مختلف الرائے تھے، اور احادیث و عمل صحابہ سے اس کی مثالیں پیش کیں۔

دوسرے یہ کہ کتاب و سنت کے تمسک کے نتائج کا سب سے پہلا مظہر حکومت کو ہونا چاہیے یعنی طرز اول کے مطابق خلیفہ کا انتخاب شرعی طریقہ پر ہونا چاہیے، جو وراثت سے پاک ہو۔

تیسری چیز مآثر و مقابر کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں یہ بات جان لینا چاہیے کہ مقابر اور مآثر دو الگ الگ چیزیں ہیں، اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں، مسئلہ مقابر میں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احادیث صحیحہ میں بناء علی القبور اور تجصیص قبور وغیرہ کی ممانعت آئی ہے، گو ایک مختصر فریق اس کے دوسرے معنی مراد لیتا ہے، اس لئے اگر سلطان اس مسئلہ میں دنیائے اسلام کے علماء کے فیصلے کا انتظار کر لیتے تو یقیناً ان کو ناامیدی نہ ہوتی اور اس کی ذمہ داری تنہا ان کی ذات پر آنے کے بجائے دنیائے اسلام پر بٹ جاتی، مآثر کا معاملہ اس سے الگ ہے، مآثر سے مراد وہ مقامات ہیں جن کو انبیاء یا صحابہ کی جانب کسی حیثیت سے نسبت ہے،

قرآن، حدیث اور آثار سلف میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ان مآثر پر عمارتیں بنانے سے روکتی ہو، بلکہ قرآن پاک، احادیث، سیر اور آثار میں ایسے مآثر کا ذکر ہے، اس بنا پر ان مآثر کی عمارتوں کے انہدام کی شدت غلو کے سوا کوئی شرعی توجیہ نہیں ہوسکتی، ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں جاہل مسلمان بعض غیر شرعی اعمال کرتے ہیں، ایسے اعمال سے انھیں روک دینا چاہیے، یا بعض عمارتیں جو غیر شرعی طور اور غیر مستند مقامات پر بنائی گئی ہیں ان کی تصحیح و ترمیم کردی جاتی، مثلاً مولد نبوی کی موجودہ شکل یقیناً صحیح نہیں، زمانۂ سلف میں اس کی شکل مسجد کی تھی، جس میں نماز پڑھی جاتی تھی، بعد میں موجودہ شکل اصلی مولد کے کمرے کی بنالی گئی جو صحیح و مستند نہ تھی، اس کی تصحیح کردینا چاہیے تھا، مگر توڑ دینا شدت و غلو کی انتہا ہے، مقام ابراہیم، صفا، مروہ، چاہ زمزم وغیرہ تمام آثار، مآثر ابراہیمی ہیں، کیا ان کو بھی منہدم کردیا جائیگا۔

یہ تقریر ایسی پرزور اور مدلل تھی کہ کسی سے اس کا جواب نہ بن پڑا، اس کے بعد رشید رضا نے اٹھ کر کہا کہ چونکہ ہم اتحاد چاہتے ہیں اس لیے بہت سی چیزوں کا جواب دینا مناسب نہیں ہے، دو ایک عالموں نے وعظ کے رنگ کی تقریریں شروع کردیں، حافظ وہبہ نے ان سے کہا کہ ہم یہاں شاعری کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم کو کام کرنا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ پانچ چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کردی جائے جو موتمر کا نظام نامہ مرتب کرے، مگر اس کے ممبروں کے انتخاب پر کچھ اختلاف ہوا، اس لیے یہ جلسہ بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہوگیا۔

موتمر کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل مگر موتمر کے انعقاد سے پہلے اس کمیٹی کا تقرر ناگزیر تھا، اس لیے اس جلسہ کے ایک ہی دو دن بعد کمیٹی بنادی گئی، اس وقت تک اسلامی ملکوں کے جتنے وفد آچکے تھے ان میں سے ایک ایک شخص اس کمیٹی کا ممبر بنایا گیا، اس کمیٹی میں کئی دن تک موتمر کے نظام نامہ پر بحث ہوتی رہی، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما کے نمایندوں نے اس کی پوری

کوشش کی کہ موتمر کو زیادہ سے زیادہ جمہوری اور بااختیار بنایا جائے، اور اسلامی ملکوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے موتمر میں نمایندگی کا حق دیا جائے، مگر کمیٹی میں سلطان کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے ان کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی، اور سلطان نے موتمر سے اپنے حسب منشا کام لینے کے لیے بغیر کسی اصول اور ضابطہ کے اپنے زیر اثر ملکوں کو زیادہ نمایندگی دیدی، اور مختلف طریقوں سے اپنے ہم خیالوں کی تعداد بڑھانے اور منتخب شدہ نمایندوں پر بھی اثر ڈالنے کی کوشش کی، اس انتظام کے بعد حکومت حجاز کی تشکیل کا مسئلہ بھی ایجنڈے میں شامل کردیا، جس کو وہ پہلے موتمر میں زیر بحث لانا نہیں چاہتی تھی، وفد خلافت نے اس کی مخالفت کی، اس کی دلیل یہ تھی کہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اس لیے جب تک موتمر میں مختلف ملکوں کی نمایندگی کے اصول طے نہ ہوجائیں اور اس کے مطابق ان کو نمایندگی نہ دیجائے اس وقت تک اس مسئلہ کو موتمر میں زیر بحث لانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، مگر حکومت نمایندگی کے معاملہ کو گول رکھنا چاہتی تھی، اس لیے تشکیل حکومت کے مسئلہ کو ایجنڈے سے نکالدیا گیا اور وفد خلافت کی تحریک پر ایک کمیٹی موتمر میں پیش ہونے والی تجویزیں مرتب کرنے اور دوسری موتمر کا دستور اساسی بنانے کے لیے منتخب کی گئی، وفد خلافت نے موتمر کی صدارت کے لیے ترکی کے رئیس الوفد ادیب ثروت کا نام پیش کیا، اور اہل حدیث کے وفد نے حجاز کے شریف عدنان کا، کثرت رائے سے شریف کا انتخاب ہوا، اور نائب صدر وفد خلافت کے رئیس مولانا سید سلیمان ندوی اور روسی وفد کے رئیس رضاء الدین مقرر ہوئے،

موتمر کا صدر مقام مکہ معظمہ قرار پایا، اور اس کے خاص مقاصد (۱) مسلمانوں میں باہم تعارف شناسائی، اتحاد و اتفاق اور اسلامی اخوت پیدا کرنا (۲) ان کے دینی، اجتماعی، ادبی اور اقتصادی مسائل اور ان کی ترقی پر غور و فکر اور اس کے لیے عملی جد و جہد کرنا (۳) حجاز کے مقدس مقامات میں امن و امان کے استحکام پر غور و خوض کرنا اور وہاں آرام و آسائش، حفظان صحت اور مواصلات کے

وسائل فراہم کرنا، حج میں سہولتیں پیدا کرنا اور اس میں جو دقتیں پیش آئیں ان کو رفع کرنا، حجاز اور اس کے حقوق کی حفاظت اور اس کی نگرانی کرنا۔ اور یہ طے پایا کہ حج کے موقع پر ہر سال مؤتمر مکہ مکرمہ میں ہوا کرے گی، اور حسب ذیل ملک اس کے ممبر بنائے گئے۔

(۱) افریقہ جنوبی و شمالی (۲) افریقہ مغربی (۳) افغانستان (۴) امریکہ جنوبی (۵) امریکہ شمالی (۶) یورپ کے مسلمان باشندے (۷) ایران (۸) ترکی (۹) تونس (۱۰) جاوا و سماترا (۱۱) الجزائر (۱۲) حبش (۱۳) حجاز (۱۴) خلیج فارس کی ریاستیں (۱۵) روس (۱۶) ریف (۱۷) زنجبار (۱۸) مصر و سوڈان (۱۹) شام (۲۰) شرق اردن (۲۱) چین (۲۲) طرابلس (۲۳) عراق (۲۴) عسیر (۲۵) جزائر فلپائن (۲۶) فلسطین (۲۷) کانگو (۲۸) مراکش (۲۹) ملایا (۳۰) نجد (۳۱) ہندوستان۔

ان میں سے بیشتر ملکوں کو ایک رائے اور بعض خاص ملکوں کو ان کی اہمیت کی بنا پر دو اور تین رائیں دینے کا اختیار دیا گیا، دستور اساسی کی باقی تفصیلات انتظامی ہیں جن کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

موتمر کا اجلاس مؤتمر کے اجلاس کی تاریخ ۲ رجون ۱۹۲۶ء مقرر تھی لیکن بعض ملکوں کے نمایندے اس وقت تک نہیں پہنچے تھے، اس لیے بڑھا کر ۷ رجون کر دی گئی، اس وقت بھی بعض وفود نہیں پہنچ سکے، اور حج کا زمانہ بالکل قریب آگیا تھا، اس لیے مؤتمر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، حج سے پہلے اور حج کے بعد۔ حج سے پہلے کے اجلاس میں حسب ذیل ملکوں کے وفود نے شرکت کی:۔

ہندوستان وفد خلافت، وفد جمعیۃ العلماء، وفد جماعت اہل حدیث، روس، جاوا، فلسطین، بیروت و شام، مصر و سوڈان، عسیر، نجد و حجاز۔ حج کے بعد کی مؤتمر میں شریک ہونے والوں میں ترکی، افغانستان، یمن، عسیر اور مصر تھے،

۷ رجون کو مؤتمر کا پہلا اجلاس ہوا، سلطان کے خطبہ کے بعد مختلف ملکوں کے نمایندوں نے تقریریں اور تجویزیں پیش کیں جس کی تفصیل بہت طویل ہے، اس لیے صرف وفد خلافت اور

جمعیۃ کی تجویزوں کو نقل کیا جاتا ہے، انھوں نے حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:۔

(۱) حتی الامکان منہدمہ آثار کو جلد بنایا جائے (۲) جو قبریں نہیں گرائی گئی ہیں ان کو نہ گرایا جائے۔ (۳) جو قبریں گرائی جا چکی ہیں ان کی تعمیر اور ہیئت ایک کمیٹی کے سپرد کی جائے جو سنی اور شیعہ علما پر مشتمل ہو۔ (۴) حرم میں باری باری سے چاروں مذہب کے اماموں کو امامت کا موقع دیا جائے (۵) بلاد مقدسہ کو غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حجاز میں ان کو کسی قسم کے اقتصادی امتیازات اور مراعات نہ دیے جائیں (۶) اسلامی کمپنیوں سے معاہدہ کرتے وقت بھی یہ شرط کر لی جائے کہ جب کسی معاملہ میں فریقین میں اختلاف ہوگا تو دونوں ملکوں کو عدالت حجاز کی طرف رجوع کرنا اور اس کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا (۷) کمپنی کے حصہ داروں کو غیر مسلموں کے ہاتھ اپنے حصے بیچنے کی اجازت نہ ہوگی (۸) غلامی کا انسداد (۹) جدہ، مکہ اور عرفات کے درمیان سڑک اور قافلہ کی منزلوں پر سراؤں کی تعمیر اور ان میں آرام آسائش کے سامانوں کی فراہمی (۱۰) تبلیغ کے نظام کا قیام (۱۱) مذاہب کی آزادی (۱۲) مطاف و سعی میں آزادی اور آسانی و سہولت کی فراہمی۔

یہ سب تجویزیں مؤتمر نے منظور کیں، اور چند تجویزیں مسترد کر دیں (۱) بغیر قصاص کے کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے (۲) حکومت حجاز اور دوسری حکومتوں کے درمیان جو معاہدے ہوں وہ عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے مؤتمر میں پیش کیے جائیں (۳) حجاز میں غیر مسلم حکومتیں بھی مسلمان سفیر رکھنے کی کوشش کریں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ وفد خلافت گو اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، مگر اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں، اور مؤتمر کے فیصلے حکومت کی آیندہ پالیسی پر اثر انداز ہوئے۔ آخر جولائی ۲۶ء وفد ہندوستان واپس آیا۔

حجاز کے مسئلہ خصوصاً آثار و مقابر کے انہدام نے ہندوستان میں بڑی نزاعی شکل اختیار کر لی تھی، اور اس سلسلہ میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے، اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

حج و زیارت مدینہ طیبہ | اس سفر میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج اور زیارت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے، اور وفد کی ذمہ داریوں اور اس کی مشغولیتوں کے باوجود علمی مقاصد بھی پیش نظر رہے، حرمین کے بڑے بڑے کتب خانوں کو دیکھا اور اس کے فوائد میں ناظرین معارف کو بھی شریک کیا، اس کا ذکر آئندہ اپنے موقع پر آئے گا۔

حج و سفر کی مختصر روداد | اس سفر کی مختصر روداد جو درحقیقت اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ہلکا سا تبصرہ ہے خود ان کے قلم سے سننے کے قابل ہے، ستمبر ۱۹۲۶ء کے معارف میں لکھتے ہیں:

"الحمد للہ تعالیٰ کہ ساڑھے تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد ذریعۂ حج و زیارت سے مشرف ہو کر آج معارف کا اڈیٹر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہے، ان ساڑھے تین مہینوں میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، کانوں نے جو کچھ سنا اور دل نے جو مشاہدہ کیا یہ داستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان صفحات کے ذریعہ کبھی کبھی آپ تک پہنچتی رہے گی۔

مکہ مکرمہ میں موتمر اسلامی کے سبب سے ڈیڑھ ماہ قیام رہا، مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک ۱۲ منزلیں طے کرنے میں ۱۲ دن صرف ہوئے، اور ۱۲ دن مدینہ منورہ میں قیام رہا، مکہ معظمہ سے تو ایک حد تک طبیعت سیر ہو چکی تھی، مگر افسوس کہ مدینہ مبارکہ سے سیری نہ ہوئی

ع   باز ہوائے چمنم آرزو ست

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک کی بارہ منزلیں نہایت آسانی سے طے ہوئیں اور ہر منزل میں ایک نئی دلچسپی نظر آتی تھی، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر منزل کی قلمی تصویر ناظرین کے چشم خیال تک پہنچا سکوں، راستوں کا نشیب و فراز، پہاڑوں کا سلسلہ در سلسلہ، کہیں چشمے کہیں کنوئیں، کہیں بدوؤں کے جھونپڑے، کہیں ببول کے درخت، کہیں ریگستان، عجیب عجیب منظر نظر سے گذرے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان عجیب فرق نظر آیا، صوفیہ کی اصطلاح میں یہ کہنا چاہئے

کہ شان جلال اور مدینہ شان جمال کا منظر ہے۔ آب و ہوا، جائے وقوع، آبادی لوگوں کے اخلاق، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے عمارات ہر چیز میں یہ فرق محسوس ہوتا ہے اور دل لذت پاتا ہے۔

علمی اور تعلیمی حیثیت سے بھی ان دونوں شہروں میں یہی فرق ہے، مکہ معظمہ میں پرانے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ کی عمارت موجود نہیں، حرم کے بعض اطراف میں سلطان محمود نے جو مدرسے بنوائے تھے وہ اشراف کے شخصی تصرفات میں داخل ہو کر محو ہو چکے ہیں، مگر مدینہ منورہ میں اب تک ان مدرسوں کی مستقل عمارتیں خواہ وہ کیسی ہی ویرانی کی حالت میں ہوں، موجود اور مسلمانوں کی حالت زار پر نوحہ خواں ہیں، مکہ معظمہ میں دو عمومی کتب خانے ہیں، بڑا کتب خانہ جو حرم کے اندر ہے، سلطان محمود کی طرف منسوب ہے، اس میں ہر علم و فن کی چھ سات ہزار کتابیں ہوں گی، جو زیادہ تر قلمی ہیں، دوسرا کتب خانہ ایک ترک عالم شروانی کا موقوفہ ہے اور اس کی نسبت سے کتب خانہ شروانی کہلاتا ہے، وہ مٹ چکا ہے، اور شریف کے عہد میں برباد ہو چکا ہے، اس میں اب صرف چند سو کتابیں ہیں،

مدینہ منورہ میں اس وقت بھی بہت چھوٹے بڑے کتب خانے موجود ہیں، جن میں سب سے بڑا شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا کتب خانہ ہے، جس کا حال معارف کے کئی نمبر میں شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ کتب خانہ محمودیہ اور کتب خانہ سیدنا عثمان قابل ذکر کتب خانے ہیں، ان دو پچھلے کتب خانوں میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی نادر کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔

ہم نے ان تینوں کتب خانوں کی نادر کتابوں کی فہرست مرتب کرلی ہے، ترکوں نے جنگ عظیم میں جہاں مدینہ منورہ کے نادر تحفے قسطنطنیہ منتقل کر دیے وہاں ایک خاص آدمی

بھیجکر ان کتب خانوں کی بہت سی نادر کتابیں بھی منتقل کرالیں، اور ہم کو معلوم ہوا ہے کہ قسطنطنیہ کے کتب خانۂ عمومی میں وہ موجود ہیں، اور یہ بھی سنا ہے کہ ان کتابوں میں جن کے دو نسخے وہاں ہونگے ان میں سے ایک نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں دیدیا جائے گا،

یہ تمام کتب خانے ترکی سلاطین کے جمع اور وقف کیے ہوئے ہیں اور ان پر انکی مہریں ہیں، پہلا کتبخانہ البتہ ایک ترک عالم کا موقوفہ ہے، اور دو تین وجوہ سے وہ سب سے بہتر ہے، ایک تو یہ کہ اس کی عمارت اور خود کتب خانہ نہایت اچھی حالت میں ہے، روزانہ باقاعدہ کھلتا اور بند ہوتا ہے، دوسرے اوپر سے لیکر نیچے تک اس میں ترک ملازم ہیں، تیسرے اس میں ہر علم و فن کی کتابیں ہیں۔

مسجد نبوی کو حقیقت میں سلطان عبدالمجید خاں نے عروس المساجد بنادیا ہے، اسقدر خوبصورت اور اس قدر صنعت کاریاں ہیں کہ بے اختیار زائر کی زبان سے احسنت اور جزاک اللہ نکل جاتا ہے، اس مسجد کا تاریخی نقشہ ہاتھ آیا ہے، کبھی وہ آپکے سامنے آئے گا، اسی کے ساتھ میں نے مسجد نبوی کی موجودہ شکل وصورت اور خصوصیات کی الفاظ وحروف کے رنگ میں تصویر اتاری ہے، وہ بھی آپ دیکھیں گے۔

جنۃ المعلیٰ (مکہ کا قبرستان) اور جنۃ البقیع (مدینہ کا قبرستان) اب عمارتوں، قبوں اور گنبدوں سے خالی ہے، اکثر قبریں محض قبر کی حیثیت سے باقی اور نمایاں ہیں، ان پر کوئی دیوار یا حصار یا قبہ نہیں ہے، بعض قبروں پر سے قبے اتار دیے گئے ہیں، اور صرف چاردیواری چھوڑ دی گئی ہے، چنانچہ جنۃ المعلیٰ میں حضرت ابوطالب اور عبدالمطلب کی طرف جو قبر منسوب ہے، اس کی چاردیواری اب تک کھڑی ہے، جنۃ البقیع میں کوئی دیوار بھی باقی نہیں ہے، صرف قبریں نمایاں ہیں، ان پر کوئی کتبہ بھی نہیں ہے، سیدنا حمزہ کے مزار (واقع احد) کا گنبد

بھی اتار دیا گیا ہے اور صرف چاردیواری باقی ہے اور مسجد کے دالان سے اس کا دروازہ بند کرکے باہر سے اس کا راستہ دیوار توڑ کر بنایا گیا ہے اور پھاٹک لگا دیا گیا ہے، یہ صورت حال شرعی ہے یا نہیں، اس پر اسلامی فرقوں میں جو جنگ برپا ہے اس کا نتیجہ دیکھیے کیا ہو

مسئلہ حجاز کے متعلق سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بہت سی باتیں ہیں جن کو ہمارے دوست معارف کی زبان سے سننے کے متوقع ہوں گے، لیکن اس کی گتھیاں اس قدر الجھی ہوئی ہیں کہ ہم ان کو سلجھانے سے علانیہ عاجز ہیں اور معارف کو ان مباحث میں پھنسانا نہیں چاہتے۔

موتمر اسلامی یقیناً ایک دلفریب موضوع ہے، یہ موتمر مسلمانوں کی پوری ایک صدی کے خواب کی تعبیر ہے، اس میں ۲۱ اسلامی ملکوں کے نمایندوں نے شرکت کی اور کل نمایندوں کی تعداد ۶۹ کے قریب تھی، اگر اس موتمر میں کمی تھی تو یہ کہ ایران، عراق، چین اور مصر سوڈان کے علاوہ افریقہ کے مسلمانوں کے نمایندے اس میں شریک نہیں تھے، ایک مہینہ کے قریب اس کے عام جلسے ۸ بجے صبح سے لیکر ایک بجے تک اور خاص جلسے عصر سے لیکر عشا تک ہوتے رہے، اس میں ۱۵ کے قریب مختلف تجویزیں پیش ہوئیں جن کا زیادہ تر تعلق حجاز سے تھا۔

امسال کے حج کی خصوصیت یہ تھی کہ عام حاجیوں کے علاوہ ہر ملک کے ارباب فکر اور اہل علم بھی آئے تھے، اور انھوں نے حجاز اور عالم اسلامی کے مسائل پر باہم غور ومشورہ کیا، اگر اس موتمر کو مضبوط اور مستحکم کیا جائے اور اس کی قوت کو سال بسال بڑھایا جائے تو عجب نہیں کہ مسلمانوں کی لیگ آف نیشن (جمعیۃ الاقوام) بن جائے۔

امسال سرسری اندازے کے مطابق پونے دو لاکھ حاجی مختلف ملکوں سے آئے جن میں سب سے زیادہ نجد کے لوگ تھے، جن کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، ان کے بعد ہندوستان کا درجہ تھا، جہاں سے ۲۷ ہزار حاجی آئے تھے، پھر مصری تھے، جو ۲۰ ہزار کے قریب تھے، جاویوں کا اندازہ

دس ہزار ہے، یعنی چار پانچ سو ہوں گے، سوڈانی اور تکرونی بھی اسی قدر، بخاری و افغانستانی دو ہزار ہوں گے، ترک ساٹھ ستر، یگوسلیویا اور البانیہ وغیرہ کے بھی حاجی آئے تھے۔ یگوسلیویا کے ۲۰ حاجی تھے، سب سے کم روس اور روس سے بھی کم تونس، مراکش اور الجیریا کے حاجی تھے، جن کی تعداد چند سے زیادہ نہ ہوگی، شیعوں کی تعداد بھی ہمارے خیال میں ڈیڑھ دو سو ہوگی۔

سب سے دور دراز راستہ سے جو حاجی آئے تھے وہ نائیجیریا (افریقہ) کے تھے، یہاں ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد ہے، ایک برائے نام سلطان ان پر حکمراں ہے، اور اصلی قبضہ انگریزوں کا ہے، یہ حاجی نائیجیریا سے مکہ معظمہ تک تقریباً ۹ مہینوں میں پہنچتے ہیں، اور ان ۹ مہینوں کا بڑا حصہ انھوں نے پیادہ پا طے کیا تھا، ان میں بوڑھے بھی تھے، نوجوان بھی تھے، مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، جاہل بھی تھے پڑھے لکھے بھی تھے، مگر بڑے مسکین اور نیک لوگ تھے، نائیجیریا سے سوڈان تک پیادہ سفر کرکے سوڈان میں ان کو ریل نظر آئی، جس پر وہ پورٹ سوڈان پہنچے، پورٹ سوڈان سے جہاز پر جدہ آئے، پھر جدہ سے مکہ معظمہ اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک وہی بادیہ پیمائی تھی، مذہب کے نشۂ روحانی کے سوا اور کون چیز ان تکالیف کو سہل اور آسان بنا سکتی ہے۔

مہینوں کے بعد ہندوستان بلکہ دنیا سے واقف ہوا ہوں، اس لیے عرب سے باہر کے حالات و واقعات سے ناآشنائی ہے، بلکہ ناواقفیت ہے، اس بنا پر ہندوستان میں اور گوشوں کے متعلق کوئی نقد و تبصرہ نہیں، ابھی کچھ دنوں مانوس ہونے دیجیے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

ازجناب مولوی حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں جن باکمال مشاہیر نے دنیائے علم و فضل میں نام روشن کیا اُن میں علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی کا نام بہت نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے، علوم وفنون کی جامعیت اور مہارت میں اُن کی نظیر نہ صرف ان کے معاصرین علماء میں مفقود ہے، بلکہ بعد کی صدیوں میں بھی خال خال ہی ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جو مہارت فنی، باریک بینی، نکتہ سنجی، دقیقہ رسی اور ذکاوت و فطانت میں حافظ العصر عسقلانی کی ہم پلہ ہوں۔

شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نے علامہ جلال الدین سیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) اور حافظ ابن حجر کا موازنہ کیا ہے، اور ان کو حافظ سیوطی پر ترجیح دی ہے، بستان المحدثین میں رقم طراز ہیں کہ

"ابن حجر کی تصنیفات ۱۵۰ سے زائد ہیں، اور جلال الدین سیوطی کی تصنیفات سے بہتر و محکم تر ہیں، کیونکہ جلال الدین سیوطی کی تصنیف اگرچہ عدد میں زیادہ ہیں، لیکن ابن حجر کی تصنیف اکثر بڑی اور کبیر الحجم ہیں، اور مضامین جدیدہ اور فوائد مفیدہ ان میں موجود ہیں، عالم متبحر اچھی طرح جانتے ہیں کہ حافظ ابن حجر کا اتقان و انضباط علوم بھی جلال الدین سیوطی سے بڑھا ہوا ہے، مگر جلال الدین سیوطی عبور و اطلاع میں، ان سے فی الجملہ زیادہ ہیں" (بستان المحدثین ص ۱۱۵)

حقیقت یہ ہے کہ دونوں اکابر اپنی اپنی صفات میں ممتاز ہیں، جیسا کہ خود شاہ صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ "اتقان و انضباط علوم" میں ابن حجر کا درجہ بڑھا ہوا ہے، اور "عبور و اطلاع" میں علامہ سیوطی ان پر تفوق رکھتے ہیں،

ذیل میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے تفصیلی حالات اور کارنامے ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں، ان سے حافظ صاحب کے علو مرتبت کا پورا اندازہ ہو سکے گا۔

نام و نسب احمد نام، ابو الفضل کنیت اور شہاب الدین لقب تھا، پورا نسب نامہ یہ ہے:
احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد[1]۔ علامہ سیوطی اور حافظ ابن فہد مکی نے محمد بن علی کے بعد ابن محمود بن احمد بن حجر بن احمد کا اضافہ کیا ہے[2]، ابن حجر کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے، جد امجد کا لقب بھی ابن حجر تھا[3]، یا تو تفاؤل کے لیے حافظ ابن حجر نے اپنا لقب ابن حجر رکھا یا جیسا کہ ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ آل حجر کی نسبت سے ابن حجر مشہور ہوئے[4]۔

آل حجر کا قبیلہ ارض قابس میں آباد تھا، پھر وہاں سے منتقل ہو کر جرید کے جنوبی حصہ میں سکونت پذیر ہو گیا[5]۔ یہ خاندان بہت مردم خیز تھا، اس میں محدثین اور فقہاء کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی،

حافظ ابن حجر کے نام کے ساتھ عسقلانی اور مصری کی نسبت جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے، ایک زمانہ میں عسقلان فلسطین کا خوبصورت ترین شہر تھا، خوبصورتی اور حسن کی بنا پر اسے عروس شام کا خطاب دیا جاتا تھا، صاحب روضات نے تلخیص الآثار کے حوالہ[6] سے تحریر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک بھی اسی شہر میں مدفون ہے[7]، مصری کہلائے جانے

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۷۔ [2] نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۴۵ و لحظ الالحاظ ص ۳۲۶ [3] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۶ و البدر الطالع ج ۱ ص ۸۷ [4] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۰ [5] ایضاً [6] روضات الجنات ج ۱ ص ۷۹

کی وجہ یہ ہے مصر ہی آپ کا مولد و منشا ہے، اور تحصیل علم کے بعد بھی اسی کے مختلف خطوں میں آپ کا قیام رہا، اور یہیں پیوند خاک بھی ہوئے،

ابن حجر عسقلانی اور ابن حجر مکی یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ گذشتہ صدیوں کے مشاہیر فضلاء میں ایک ہی نام کی دو شخصیتیں گذری ہیں اور یہ دونوں آسمان علم و فضل کے درخشاں کوکب اور بحر تحقیق و تدقیق کی در تابندہ تھیں، ان دونوں کی شہرت و مقبولیت کی بنا پر بسا اوقات اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ دونوں میں نام ہی کا اشتراک نہیں بلکہ دونوں شافعی المذہب اور اشعری تھے، اور دونوں کا قیام مکہ معظمہ میں طویل عرصہ تک رہا[1]،

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) کا شمار نویں صدی کے فضلاء میں ہوتا ہے، اور ابن حجر مکی (المتوفی ۹۷۴ھ) ان سے بہت متاخر یعنی دسویں صدی میں تھے، اور حافظ ابن حجر عسقلانی سے دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں، اور اپنی تصانیف میں ان سے روایت کرتے وقت قال شیخ الاسلام کے الفاظ استعمال کرتے ہیں[2]۔

ابن حجر مکی شوافع کے بڑے مجتہدین میں ہیں، شیعوں کے شدید ترین مخالف تھے، ان کے رد میں ان کی تصنیف صواعق محرقہ بہت مشہور ہے، مکہ میں آخر عمر تک رہنے کی وجہ سے مکی مشہور ہوئے[3]،

ولادت اور ابتدائی حالات حافظ ابن حجر شعبان ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے، مقام ولادت مصر کے علیقہ نامی ایک قریہ بتلایا جاتا ہے[4]،

صغر سنی ہی میں اپنے والد ماجد شیخ نور الدین علی کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:-

[1] روضات الجنات ج ۱ ص ۸۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۴۹ [3] ایضاً ج ۱ ص ۸۹ [4] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۶ و معجم المطبوعات ج ۱ ص ۸۱

تر کنی لہ اکمل اربع سنین و — جب میرے والد فوت ہوئے تو میری عمر کے
انا الآن اعقلہ کالذی یخیل — چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے .
الشیٔ ..... واحفظ انہ قال — اور آج مجھے وہ بالکل ایک خیال کی طرح
کنیۃ ولدی ابو الفضل[1] — یاد ہیں ...... اتنا یاد آتا ہے کہ انھوں نے
کہا میرے لڑکے (ابن حجر) کی کنیت ابو الفضل ہے

اس لیے آپ نے زکی خرنوبی نامی ایک شخص کی کفالت میں نشو ونما پائی جنھیں آپ کے والد نے وفات کے وقت وصی مقرر کیا تھا[2]۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حافظ ابن حجر کے والد کی کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی، اس شکستہ دلی میں ایک دن مشہور بزرگ شیخ صناقیری کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض حال کیا، شیخ نے دعا کی اور فرمایا کہ "تیری پشت سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو پوری دنیا کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیگا" شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں کہ ابن حجر کی تصنیفات کی اتنی مقبولیت اور شہرت شیخ صناقیری کی اسی دعا کا نتیجہ ہے[3]۔

باقاعدہ تعلیم کا آغاز کرنے سے پہلے مصر ہی میں شیخ صدر السفطی شارح مختصر التبریزی سے کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا، حافظہ غیر معمولی پایا تھا، اس لیے صرف نو سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے[4]، اور قرآن ہی نہیں بلکہ العمدہ، الفیۃ الحدیث للعراقی، الحاوی الصغیر اور مختصر ابن الحاجب بھی زبانی یاد کر لیں[5]۔

ابتداء میں شعر و سخن سے ذوق ہی نہیں شغف رکھتے تھے، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ

---

[1] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۱۰، [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۷، [3] بستان المحدثین ص ۱۴۸ و اتحاف النبلاء ص ۱۹۳

[4] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۸، [5] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۷

عانی اولاً الادب والشعر — پہلے ادب اور شعر کی طرف توجہ مبذول کی
فبلغ فیہ الغایۃ[1] — اور اس میں مہارت پیدا کر لی .

اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا تھا کہ آپ کے کلام سے لوگ استناد کرتے تھے۔ شاعری پر آئندہ تفصیلی گفتگو کیجائے گی .

علمی سفر ۷۸۵ھ میں حافظ صاحب اپنے وصی زکی خرنوبی کے ہمراہ مکہ مکرمہ گئے اور فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد وہاں کے مشاہیر علماء و فضلاء کے حلقہائے درس میں شرکت کی، سب سے پہلے شخص جس سے آپ کو تلمذ کا شرف حاصل ہوا، شیخ عفیف الدین النشاوری ہیں آپ نے ان سے صحیح بخاری کی سماعت کی، ان کے علاوہ عالم حجاز حافظ ابو حامد محمد بن ظہیرہ[2] اور شیخ جمال بن ظہیرہ سے کسب فیض کیا، اور اسی سال مسجد حرام میں تراویح میں پورا کلام مجید سنایا، خود فرماتے ہیں

وصلیت فی تلک السنۃ — اور میں نے اس سال لوگوں کو تراویح
بالناس التراویح[3] — پڑھائی .

پھر جب اپنے سن رشد کو پہنچے تو ان کی توجہ اس علم شریف کی طرف پھر گئی جس کی بنا پر ان کو شہرت دوام حاصل ہوئی، چنانچہ ابن حجر کی شہرت اور مقبولیت جتنی شارح حدیث کی حیثیت سے ہے، اتنی کسی اور حیثیت سے نہیں ہوئی، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس علم کی خدمت کے لیے پیدا کیا تھا اس لیے ان کو اس سے والہانہ شغف تھا[4]،

حدیث کے تمام سرچشموں سے سیرابی حاصل کرنے کے لیے دور دراز ممالک کا سفر کر کے حدیث کی سماعت کی، تحصیل علم کے لیے آپ نے جن ملکوں کا سفر کیا، ان میں حرمین شریفین کے علاوہ

---

[1] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۰، [2] لحظ الالحاظ ص ۳۲۶، [3] الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۲ ص ۳۰۱، [4] نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۴۵ و البدر الطالع ج ۱ ص ۸۷

اسکندریہ، نابلس، رملہ، غزہ، یمن[1]، قبرص، شام اور حلب[2] وغیرہ شامل ہیں، اسی بنا پر آپکے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، جیسا کہ ابن فہد مکی نے لکھا ہے کہ

مشائخہ کثیرۃ جداً لا توصف	ان کے شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے جنکو
ولا تدخل تحت الحصر[3]	نہ بیان کرنا ممکن ہے اور نہ شمار کرنا۔

یہ بھی ابن حجر کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو اساتذہ و شیوخ کی ایسی منتخب جماعت میسر آئی جس کا ہر فرد اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا، علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

ادرک من الشیوخ جماعۃ	انھوں نے شیوخ کی ایسی جماعت
کل واحد راس فی فنہ الذی	پائی جس کا ہر فرد اپنے فن میں مشہور
اشتہر[4]	و ماہر تھا۔

اور حافظ سخاوی لکھتے ہیں:

واجتمع لہ من الشیوخ	انھیں اتنے شیوخ میسر آئے ......
مالم یجتمع لاحد من اہل عصرہ	جتنے ان کے معاصرین میں سے کسی کو نہ
لان کل واحد منہم کان متبحراً	مل سکے، اس میں سے ہر فرد بحر العلم اور
فی علمہ ورأساً فی فنہ الذی	اپنے فن میں ماہر و مشہور تھا،
اشتہر بہ[5]	

۷۹۶ھ میں آپ قاہرہ وارد ہوئے اور حافظ زین الدین العراقی سے علم حدیث کی تحصیل کی[6] اور اس میں اتنا کمال پیدا کر لیا کہ ان کے شیخ نے حدیث پڑھانے کی اجازت فرما دی[7]، اسی طرح

[1] لحظ الالحاظ ص ۳۲۲ [2] بستان المحدثین ص ۱۱۳ [3] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۲۸ [4] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۸ [5] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۷ [6] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۱ [7] لحظ الالحاظ ص ۳۲۸

فقہ میں شیخ سراج الدین البلقینی، حافظ ابن الملقن، شیخ برہان الدین الابناسی، اور نور الدین الہیثمی کے سرچشمۂ فیض سے سیرابی حاصل کی[1]، شیخ البلقینی نے آپ کو سب سے پہلے افتاء و تدریس کی اجازت دی[2]۔

مذکورۂ بالا مشاہیر فضلاء کی صحبت نے حافظ ابن حجر کے دل میں حصول کمال کا اور ولولہ پیدا کر دیا، چنانچہ انھوں نے دوسرے اسلامی ملکوں کا بھی سفر اختیار کیا، اور وہاں کے اکابر شیوخ و ماہرین فن کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف علوم میں دستگاہ حاصل کی، چنانچہ سریا قوس میں صدر الدین الابشیطی، غزہ میں احمد بن محمد الخلیلی، رملہ میں احمد بن محمد الایکی اور خلیل میں صالح بن خلیل بن سالم، بیت المقدس میں شمس الدین القلقشندی، بدر الدین مکی، محمد المنبجی اور محمد بن عمر بن موسی، دمشق میں بدر الدین بن قوام البالسی اور فاطمہ بنت المنجا التنوخیہ، فاطمہ بنت عبد الہادی عائشہ بنت عبد الہادی اور منی میں زین الدین ابو بکر بن الحسین کے حلقہائے درس میں شریک ہو کر تحصیل علم کی، اور ان سے تحدیث اور افتاء و تدریس کے اجازت نامے حاصل کیے[3]۔

لغت میں مجد الدین الفیروز آبادی صاحب القاموس، ادب میں عماری اور محب بن ہشام اور علم عروض میں پختگی[4]، کتابت[5] میں ابو علی الزفتاوی اور نور الدین البدماصی[6]، قرأت سبعہ میں تنوخی اور متفرق علوم میں عز بن جماعہ سے مہارت حاصل کی،

[1] نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۴۵ [2] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۱ [3] لحظ الالحاظ ص ۳۳۳ [4] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۱ [5] یہاں کتابت سے مراد خوشنویسی نہیں، بلکہ سرعت کتابت ہے یعنی حافظ ابن حجر تیز لکھنے میں ماہر تھے، جیسا کہ ابن فہد مکی نے تصریح کی ہے کہ کان سریع الکتابۃ، ورنہ حافظ صاحب انتہائی بدخط واقع ہوئے تھے، بلکہ خط کی بدنمائی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ انکی تحریروں کو صرف ممارست ہی کی بنا پر پڑھنا ممکن ہوتا تھا (حاشیہ لحظ الالحاظ ص ۳۳۶) [6] دیباچہ فتح الباری ج ۱ ص ۲ و الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۶

شیخ عز بن جماعہ بہت سے علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ اپنے متعلق خود فرماتے تھے،

انا اقرئ خمسۃ عشر علماً لایعرف علماء عصری اسماءھا[1] — میں ایسے پندرہ علم پڑھاتا ہوں جن کے نام بھی میرے ہمعصر علماء نہیں جانتے۔

مذکورۂ بالا شیوخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر کو مختلف فنون میں ان کے ائمہ اور ماہرین سے استفادہ کا موقع ملا، تنوخی قراءت سبعہ میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں، عراقی حدیث اور اس کے متعلقات میں، ہیثمی متون کے حفظ و استحضار میں، بلقینی سعت حفظ و کثرت اطلاع میں، ابن الملقن کثرت تصانیف میں، مجد الفیروز آبادی لغت میں، عماد ادب میں اپنے اپنے وقت میں امام سمجھے جاتے تھے،[2]

درس و افادہ — تحصیل علوم اور ان میں کمال پیدا کرنے کے بعد حافظ ابن حجر نے درس و تدریس کی مسند بچھائی، آپ کے فضل و کمال کا شہرہ سن کر دور دراز ملکوں کے شائقین علم نے جوق در جوق آپ کی طرف ہجوم کیا، وقت کے اکابر علماء و فضلاء تک نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور مصر کے بیشتر علماء نے آپ سے فیض حاصل کیا،[3]

انھوں نے خانقاہ بیبرسیہ میں تقریباً بیس سال تک حدیث، فقہ اور قرآن کا درس دیا، اسی طرح شیخونیہ، جامع القلعہ اور جمالیہ میں کچھ عرصہ تک قال اللہ وقال الرسول کے نغمے سنائے، پھر مؤیدیہ میں فقہ کا درس دیا، آپ کے درس کی شہرت سے پوری دنیائے اسلام گونج اٹھی، اور ہر ملک کے بے شمار شائقین علم آنے لگے جن کی تعداد حد شمار سے باہر ہے، آپ کے تلامذہ میں مذاہب اربعہ کے باکمال محدثین فقہا، اور مورخین پیدا ہوئے، حافظ سخاوی

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۰ [2] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۸ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۱ [4] ایضاً

کا بیان ہے کہ

کثرت طلبتہ حتی کان رؤس العلماء من کل مذہب من تلامذتہ[1] — ان کے تلامذہ کی بہت کثرت ہوئی اور اس میں ہر مذہب کے اعیان علما شامل تھے

درس و تدریس کے ساتھ جامع ازہر اور جامع عمرو میں خطیب کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، آپ کے معمولات کا باقاعدہ پروگرام تھا، آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی ضائع نہ ہوتا تھا، طلبہ کی جماعت کو ایک معین وقت تک درس دیتے، اس کے بعد یا تصنیف و تالیف کرتے یا عبادت میں مشغول ہو جاتے، آپ نے دمشق میں دو مہینے دس دن قیام فرمایا تھا، اس مدت میں افادۂ عوام کی خاطر حدیث کی سو جلدیں پڑھیں، اور تقریباً سو مجلسوں میں املا کرایا[2]

آخری عمر میں آپ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا، تاریخ میں ایسے علما کی نظیریں خال خال ہی ملتی ہیں، جنھوں نے ایسی مقبولیت کا مشاہدہ اپنی زندگی ہی میں کر لیا ہو، اور جن سے نہ صرف عام طالبان علم بلکہ اکابر علماء اور شیوخ تک نے کسب فیض کیا ہو، اس حیثیت سے حافظ ابن حجر بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں،

تبحر علمی اور جامعیت — حافظ ابن حجر نے اپنے عہد کے تمام مشہور علمی مراکز اور یگانۂ روزگار فضلا سے کسب فیض اور ان کی صحبت سے استفادہ کیا تھا، اور تحصیل علم میں غیر معمولی محنت، جانکاہی اور عرق ریزی نے آپ کو نہ صرف اپنے عہد بلکہ تاریخ اسلام کا نامور عالم بنا دیا، چنانچہ آپ کو حافظ العصر، خاتمۃ الحفاظ، امام الائمہ، محی السنۃ، علم الائمۃ الاعلام، فرید الوقت،

[1] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹ [2] بستان المحدثین ص ۱۴۱ و اتحاف النبلاء ص ۱۹۴ [3] لحظ الالحاظ ص ۳۳۷

فخر الزمان اور عمدۃ المحققین کے خطابات سے نوازا گیا،

حافظ ابن حجر کی یہ ایک ممتاز خصوصیت ہے کہ انھوں نے جس علم کی طرف توجہ کی اس کو درجہ کمال تک پہنچا دیا، ابن فہد لکھتے ہیں کہ

جد فی طلب العلوم فبلغ الغاية القصوی[۱]	علوم کی تحصیل میں پوری محنت کی اور اس میں انتہا درجہ کی مہارت حاصل کی۔

چنانچہ ابتدا میں شعر و ادب کے ذوق ہوا تو ادبائے عصر سے اپنا لوہا منوایا، اس کے بعد جب حدیث نبوی کی طرف توجہ کی تو اس میں امامت کا درجہ حاصل کیا، اور اپنے شیوخ و اساتذہ سے اجازہ و تدریس کے ساتھ تحسین و آفریں کی سند حاصل کی[۲]،

یوں تو جامع العلوم تھے، لیکن آپ کے خصوصی علم حدیث، رجال اور فقہ تھے، اور ان میں بھی حدیث سے آپ کو زیادہ شغف تھا، اور اس میں زیادہ ناموری حاصل کی،

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

قال بعضهم كان شاعراً طبعاً	بعض کا قول ہے کہ (ابن حجر) فطری شاعر
محدثاً صناعة فقيهاً تكلفاً	ماہر محدث اور فقیہ بے بدل تھے، رجال
انتهى اليه معرفة الرجال	کی معرفت، ان کا استحضار، اس کے بلند
واستحضارهم ومعرفة العالي	و پست کی پہچان اور علل احادیث وغیرہ
والنازل وعلل الاحاديث	کی واقفیت ان پر ختم ہو گئی،
وغير ذالك[۳]	

حافظ ابن فہد مکی لکھتے ہیں:-

۱ لحظ الالحاظ ص ۳۳۴ ۲ اتحاف النبلاء ص ۱۹۴ ۳ البدر الطالع ج ۱ ص ۲۰۱

انه انفرد فی الشبوبية بين	وہ جوانی ہی میں فنون حدیث
علماء زمانه بمعرفة فنون	اور بالخصوص رجال حدیث میں اپنے ہمعصر
الحديث لاسيما رجاله وما	علما میں منفرد حیثیت رکھتے تھے،
يتعلق بهم[۱]	

خود آپ کے شیخ و استاذ حافظ زین الدین عراقی نے آپ کو "انه اعلم اصحاب الحدیث" کی سند عطا کی، تقی الدین فاسی اور برہان الدین حلبی کا قول ہے:

ما رأينا مثله[۲]	ہم نے ان کے مثل نہیں دیکھا

صاحب روضات نے آپ کو علم درایت کا پہلا مصنف قرار دیا ہے،

هو اول من صنف فی علم	وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم درایت
الدراية[۳]	میں تصنیف کی۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ان پر علم حدیث کا خاتمہ ہو گیا[۴]، حافظ ابن فہد مکی کا بیان ہے کہ

هو عديم النظير ... لم تر	وہ بے نظیر تھے ... ان کا مثل آنکھوں نے
العيون مثله ولا رأى	نہیں دیکھا اور خود انھوں (ابن حجر)
هو مثل نفسه[۵]	نے بھی اپنا مثل نہیں دیکھا،

فحول شعراء نے آپ کے ادبی و شعری کمال کا اعتراف کیا ہے، فن حدیث و رجال میں آپ کی تحقیقات سند کا درجہ رکھتی ہیں، محققین آپ کے اقوال سے بکثرت استناد کرتے ہیں۔

۱ لحظ الالحاظ ص ۳۳۲ ۲ الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹ ۳ روضات الجنات ج ۱ ص ۹۴
۴ حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۱۵۳ ۵ لحظ الالحاظ ص ۳۳۶

آپ کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ کے شیخ زین الدین العراقی کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ من یخلف بعدک آپ کا جانشین کون ہوگا، انھوں نے فرمایا کہ میں سب سے پہلے ابن حجر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں، پھر اپنے بیٹے ابوزرعہ کو اور پھر ہیثمی کو[1]۔ علامہ سیوطی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

وقد غلق بعده الباب وختم به	ان کے بعد علم کا دروازہ بند ہوگیا اور
هذا الشان[2]	اس کی شان کا خاتمہ ہوگیا۔

ذہانت اور حافظہ حافظ ابن حجر عسقلانی کو ذہانت و فطانت سے بہرہ وافر ملا تھا، جس کی شہادت خود آپ کے شیوخ و اساتذہ نے دی ہے، ابتدائے عمر ہی سے آپ کی خداداد ذہانت کے جوہر کھلنے لگے تھے، چنانچہ جب پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے تو سرعت حافظہ کی بنا پر سورۂ مریم صرف ایک دن میں حفظ کر کے لوگوں کو متحیر کر دیا۔
الحاوی الصغیر کو ایک مرتبہ استاد کی تصحیح کے ساتھ پڑھا، دوسری مرتبہ خود ہی پڑھا، اور تیسری مرتبہ میں زبانی سنا دیا[3]۔

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ

وخصائله التی لم تجتمع لاحد	ان کی گوناگوں خصوصیات ان کے
من اهل عصره وقد شهد له	معاصرین میں کسی میں نہ تھیں اور متقدمین
القدماء بالحفظ والثقة و	نے ان کے حفظ، ثقاہت، امانت، معرفت
الامانة والمعرفة التامة والذهن الوقاد	تامہ، ذہن کی تیزی اور غیر معمولی ذکاوت
والذکاء المفرط[4]	کی شہادت دی ہے۔

[1] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۸۱ [2] ایضاً ص ۳۸۲ [3] ایضاً [4] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹

اس بے نظیر ذکاوت اور قوت حافظہ کی بنا پر آپ نے حافظ الدنیا کا تمغہ حاصل کیا[1]، زبان خلق نقارۂ خدا ثابت ہوئی اور لفظ حافظ آپ کے نام کا ایسا جز ولاینفک بن گیا کہ بغیر اس کے اصل نام ناقص معلوم ہوتا ہے،
علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

شهد له بالحفظ والاتقان	ان کے حفظ و اتقان کی شہادت
القریب والبعید والعدو	ہر قریب و بعید اور دوست و دشمن
والصدیق حتی صار لفظه	نے دی حتی کہ لفظ حافظ ان کے لیے
الحافظ علیه کلمة اجماع[2]	ایک اجماعی خطاب بن گیا۔

منقول ہے کہ حافظ ابن حجر نے آب زمزم اس نیت سے پیا کہ وہ قوت حافظہ میں امام ذہبی کے برابر ہو جائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ مراد پوری کی، اور محققین کا خیال ہے کہ آپ حفظ و اتقان میں علامہ ذہبی پر فوقیت رکھتے تھے[3]۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ

له الحفظ الواسع الذی اذا	ان کا حافظہ اتنا وسیع تھا کہ بلا شبہ
وصفته فحدث عن البحر	ان کا وصف بیان کرتے وقت بحر بے
ولا حرج[4]	حجر کہا جا سکتا ہے۔

اسی غیر معمولی حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو جملہ علوم ہر وقت مستحضر رہتے تھے اور وہ اپنے طلبائے درس میں بیشتر زبانی املا کرایا کرتے تھے، علامہ سیوطی ہی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

[1] ذیل طبقات الحافظ ص ۳۸۰ [2] حافظ صاحب کو دو ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں [3] البدر الطالع ج ۱ ص ۸۸ [4] فتح الباری ج ۱ ص ۲ [5] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۸۱ [6] نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۴۵

واملی اکثر ما ینیف من الف مجلس من حفظه[1]

انھوں نے ایک ہزار سے زائد مجلسوں میں اپنے حافظہ سے املا کرایا۔

حافظ ابن فہد مکی نے آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آپ کے حفظ اور اتقان کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے،

ولم یخلف بعدہ مثلہ فی الحفظ والاتقان رحمہ اللہ تعالیٰ[2]

حفظ و اتقان میں ان کا کوئی جانشین نہ ہو سکا۔

علامہ سیوطی کا قول ہے کہ

لم یکن فی عصرہ حافظ سواہ[3]

ان کے عہد میں انکے سوا کوئی حافظ نہ تھا۔

سرعت قرأت ان کی سرعت قرأت کے بعض ایسے محیر العقول واقعات منقول ہیں جن پر اس زمانہ میں یقین کرنا مشکل ہے لیکن یہ واقعات حافظ صاحب کے اکابر تلامذہ اور بڑے بڑے علماء سے متواتراً منقول ہیں، اس لیے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا، حافظ ابن فہد مکی لکھتے ہیں

انہ قرأ البخاری فی عشرة مجالس من بعد صلوٰة الظہر الی العصر ومسلماً فی خمسة مجالس فی نحو یومین وشطر یوم والنسائی الکبیر فی عشرة مجالس کل مجلس منہا قریب من اربع ساعات[4]

انھوں نے بخاری ظہر و عصر کے درمیان کی دس مجلسوں میں ختم کی اور مسلم ڈھائی دن کی پانچ مجلسوں میں، اور نسائی دس مجلسوں میں، ان میں سے ہر مجلس تقریباً چار گھڑی کی ہوتی تھی۔

[1] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۳۰۵ و اتحاف النبلاء ص ۳۹۰ و معجم المطبوعات ج ۱ ص ۸۰، والضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹
[2] لحظ الالحاظ ص ۳۳۰ [3] نظم العقیان للسیوطی ص ۴۵ [4] لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ ص ۳۲۶

ابن فہد دوسری جگہ لکھتے ہیں :

انہ قرأ فی رحلتہ الشامیة المعجم الصغیر للطبرانی فی مجلس واحد فیما بین صلوٰة الظہر والعصر[1]

انھوں نے شام کے سفر میں معجم صغیر للطبرانی کو ظہر و عصر کے درمیان کی ایک مجلس میں پڑھا

اس عبارت میں طبرانی کی جس معجم صغیر کا ذکر ہے اور جسے حافظ صاحب نے صرف ایک مجلس میں ختم کیا، وہ ڈیڑھ ہزار احادیث مع اسناد پر مشتمل ہے،

ابن طولون کا بیان ہے کہ وھذا غایة فی الاسراع. لیکن یہ سرعت قرأت جہاں ایک طرف کمال اور وصف ہے وہیں بڑا نقص بھی ہے، کیونکہ اتنی سرعت میں ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، خلط مبحث واقع ہوجاتا ہے اور غالباً وہ تشکوک و اوہام جو حافظ ابن حجر کی تصانیف میں نظر آتے ہیں اسی سرعت قرأت کا نتیجہ ہیں، چنانچہ شیخ برہان بقاعی جو حافظ ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں ہیں لکھتے ہیں کہ "انہ یغلط فیلج فی غلطہ"[2]

شاہ عبد العزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ "وہ سنن ابن ماجہ کو چار مجلسوں میں ختم کر دیتے تھے"[3]

ذوق شعر و سخن اس دور کے علماء بھی عموماً شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے، حافظ ابن حجر کو تو ابتدائے عمر ہی سے شعر و سخن سے خاص شغف تھا، اور انھوں نے اپنی فطری ذہانت کی

[1] لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ ص ۳۳۶ [2] حاشیہ لحظ الالحاظ ص ۳۳۰ بحوالہ عنوان الزمان، حافظ سخاوی نے شیخ بقاعی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے، درانحالیکہ خود سخاوی بھی اپنی تصانیف میں ابن حجر کے تسامحات پر بکثرت گرفت کر کے امر صواب کو ظاہر کرتے ہیں [3] بستان المحدثین ص ۱۱۳ و اتحاف النبلاء ص ۱۹۳

بنا پر اس فن میں بھی پوری مہارت حاصل کر لی تھی، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ

عنی بالادب والشعر حتی برع   شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی تو ان میں بھی

فیھما ونظم الکثیر فاجاد[۱]   پوری مہارت حاصل کر لی اور کثرت سے بہت عمدہ شعر کہے

آپ کو شاعر کی حیثیت سے بھی اتنی شہرت حاصل تھی کہ مصر کے ان سات مشہور شعرا میں آپ کا نام دوسرے نمبر پر تھا جنھیں "شہاب" کہا جاتا تھا[۲]،

علامہ شوکانی نے لکھا ہے، "کان شاعراً طبعاً" وہ ایک فطری شاعر تھے[۳]،، دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

لہ ید طولی فی الشعر قد اورد   ان کو شعر میں ید طولیٰ حاصل تھا مصنفین

منہ جماعۃ من الادباء المصنفین   ادبا کی ایک جماعت نے ان کی بہترین ادبی

اشیاء حسنۃ جداً کابن حجۃ   تخلیقات نقل کی ہیں جیسے ابن حجہ نے شرح

فی شرح البدیعیہ وغیرہ وہم   البدیعیہ میں، اور یہ سب شاعری میں آپ کے

معترفون بعلو درجتہ فی ذلک[۴]   علو مرتبت کے معترف ہیں۔

حافظ ابن حجر کی شاعری کے جو نمونے منتشر طور پر کتابوں میں ملتے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ...... ادبی چاشنی کے ساتھ موعظت و حکمت کا خزینہ بھی ہے،

دیوان ابن حجر کے نام سے ان کا مجموعہ کلام بھی موجود ہے جس میں ہر صنف سخن کے

---

۱ نظم العقیان فی اعیان الاعیان ص ۵۴ ۲ ایضاً قاہرہ میں اس زمانہ میں سات مشہور شعرا تھے جن میں سے ہر ایک کو "شہاب" کہا جاتا تھا، حافظ سیوطی نے اس خطاب کی وجہ تسمیہ نہیں لکھی لیکن ظاہر ہے کہ وہ پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر رہے ہوں گے، ان کے نام یہ ہیں: ابن الشاب التائب، ابن حجر، ابن ابی السعود، ابن مبارک شاہ، ابن صالح، حجازی منصوری ۳ البدر الطالع ج ۱ ص ۸۸ ۴ ایضاً ج ۱ ص ۹۱

الگ الگ اشعار ہیں، یہ دیوان سات اصناف سخن پر مشتمل ہے: نبویات[۱]، ملوکیات[۲]، اخوانیات[۳]، غزلیات[۴]، اغراض[۵]، موشحات[۶]، مقاطیع[۷]

آغاز دیوان میں مدح رسول میں ایک طویل قصیدہ ہے جس میں صحیح بخاری کے ختم کا بھی ذکر ہے، نواب صدیق حسن خاں کے بیان کے مطابق اس دیوان کا ایک نسخہ ان کے پاس موجود تھا، ایک نادر نسخہ کتب خانہ خدیویہ اور ایک جامع الباشا موصل میں ہے،

کلام کا عمومی رنگ یہ ہے:-

اجبت وقاد النجم ساطع   انزلتہ برضا الغرام فؤادی

وانا الشہاب[۲] فلا تعاند عاذلی   ان نحو الکواکب الوقاد[۳]

درج ذیل قطعہ میں کتنی حکیمانہ بات کہی ہے:-

ثلث من الدنیا اذا ھی حصلت   لشخص فلن یخشی من الضر والضیر

تین چیزیں دنیا میں ایسی ہیں کہ اگر کسی کو حاصل ہو جائیں تو اسے کسی نقصان یا تکلیف کا خوف نہ کرنا چاہیے

غنی عن بنیھا والسلامۃ منھم   وصحۃ جسم وخاتمۃ خیر[۴]

ایک اہل دنیا سے بے نیازی اور ان سے مامون رہنا، دوسرے تندرستی اور تیسرے خاتمہ بالخیر

ایک قطعہ میں عشرہ مبشرہ صحابہ کرام کو اس طرح جمع کر دیا ہے:

لقد بشر الھادی فی الصحب زمرۃ   بجنات عدن کلھم فضل اشتھر

بلاشبہ ہادی نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت کو جنت خلد کی بشارت دی جن کا فضل مشہور ہے

---

۱ اتحاف النبلاء ص ۱۹۴ ۲ مذکور ہوا کہ حافظ صاحب مصر کے "سبعہ اشہب" میں سے ایک تھے، اسی کی طرف اشارہ ہے ۳ شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۳ ۴ نظم العقیان للسیوطی ص ۵۱

سعید، زبیر، سعد، طلحۃ، عامر — ابوبکر، عثمانؓ، عوف، علی، عمرؓ

وہ سعید، زبیر، سعد، طلحہ، عامر — ابوبکر، عثمان بن عوف، علی اور عمر ہیں

اپنی وفات سے تین سال پیشتر اپنی کتاب "الامالی الحدیثیہ" کے بارہ میں جو ایک ہزار سے زیادہ مجالس پر مشتمل ہے، گیارہ اشعار کی ایک نظم کہی تھی، جسکے ابتدائی دو شعر یہ ہیں،

یقول راجی الله الخلق احمد من — اهل الحدیث نبی الخلق متنقلا

کہتا ہے احمد جو اللہ تعالیٰ سے امید کرنے والا ہے، اور عام مخلوق کے نبی کی حدیث نقل کرنے والوں سے ناقل ہو

تدنوا من الالف ان عدت مجالسه — تخریج اذکار رب ناقد وعلا[1]

ہزار کے قریب ہیں اگر اسکی وہ مجلسیں شمار کیجائیں جن میں اس نے ایسے رب کے ذکر کیے ہیں جو برتر و ناقد ہے

حافظ ابن حجر بہت برجستہ گو شاعر تھے، ان کی برجستہ گوئی کے متعدد نمونے بستان، نظم العقیان اور ذیل طبقات الحفاظ میں ملتے ہیں،[2] آپ کے مزاج میں مزاح و خوش طبعی بھی تھی جس کا کبھی کبھی مظاہرہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ عہدۂ قضا پر شمس قایاتی کا ان کی جگہ تقرر ہوا تو حسن اتفاق سے کسی تقریب میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کھانا کھایا، اس موقعہ پر حافظ صاحب نے برجستہ یہ قطعہ کہا:

عندی حدیث ظریف بمثله تلقی — من قاضیین یعزی هذا وهذا یهنا

یہ ایک دلچسپ قصہ ہو کر اسکے مثل سے ایسے دو قاضیوں میں ملاقات ہوگئی کہ ایک تعزیت کرتا ہے اور دوسرا مبارکباد دیتا ہے

یقول ذا اکرهونی وذا یقول استرحنا — ویکذبان جمیعا فمن یصدق منا[3]

وہ کہتا ہے کہ مجھے قاضی بننے پر مجبور کیا اور یہ کہتا ہے کہ ہم نے معزول ہو کر راحت پائی، حالانکہ دونوں جھوٹے ہیں پس ہم میں کون سچا ہے

حافظ ابن فہد مکی اپنے شیخ کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں

۱ فتح الباری ج ۱ ص ۴ ۲ بستان المحدثین ص ۱۱۶ ۳ بستان المحدثین ص ۱۱۶ و نظم العقیان للسیوطی ص ۱ ۴ لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ ص ۳۳۹ ۵ بستان المحدثین ص ۱۱۴

وقال الشعر الحسن الذی هو ارق من النسیم وطارح الادباء[1] — انھوں نے ایسے عمدہ شعر کہے جو بادِ نسیم کی طرح نرم و نازک ہیں،

حافظ سخاوی فرماتے ہیں:

وانشد من نظمه فی المحافل — ان کی نظمیں محفلوں میں پڑھی گئیں اور انکے

وخطب من دواوینه علی المنابر — خطبے منبروں پر دیے گئے کیونکہ وہ نظم و

لبلیغ نظمه ونثره[2] — نثر کی بلاغت کا شاہکار ہیں

خاکساری و فروتنی

لیکن بااین ہمہ تبحر علمی اور جلالت شان فروتنی اور تواضع کا پیکر تھے، اپنی جانب کسی بڑائی کو منسوب نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ برہان الفقیہ نے آپ سے سوال کیا "رأیت مثل نفسك" یعنی تم نے اپنا مثل دیکھا ہے؛ اس کے جواب میں فرمایا "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی"[3]

اہل علم کا بڑا احترام کرتے تھے، اپنی رائے پر اصرار نہ تھا، اگر بحث میں حق واضح ہوجاتا تو اس کو بلا تامل قبول اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے،[4]

بعض عارفین نے ابن حجر کو ولایت کی بھی بشارت دی تھی، ایک بزرگ کا قول ہے کہ "ان علم الولایة علی راسه ان کے سر پر ولایت کا علم نصب ہے"، اور ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے

من توسل به الی الله تعالیٰ — جو شخص ان کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے

فی حوائجه قضیت[5] — اپنی مراد مانگے گا تو پوری ہوگی۔

۱ لحظ الالحاظ ص ۳۲۷ ۲ الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۸ ۳ ایضاً ج ۲ ص ۳۹ ۴ فتح الباری ج ۱ ص ۲ ۵ الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹

منصب قضا: حافظ ابن حجر نے قضا کی آزمائشوں میں مبتلا نہ ہونے کا شروع ہی سے عزم کر لیا تھا،[1] سلطان مؤید نے آپ کو شام کا منصب قضا بارہا سپرد کرنا چاہا مگر ہر مرتبہ آپ نے شدت سے انکار کیا،[2] لیکن قدرت کو اس سلسلہ میں بھی آپ سے خدمات لینا مقصود تھا، اس لیے محرم ۸۲۷ھ میں جب ملک اشرف برسبای نے منصب قضا قبول کرنے کے لیے آپ کے احباب سے دباؤ ڈلوایا تو ناچار اس پیشکش کو قبول کرنا پڑا، جس سے آپ بحسن و خوبی ۔۔۔۔ عہدہ برآ ہوئے۔[3]

علامہ شوکانی نے حافظ ابن حجر کے منصب قضا کو قبول نہ کرنے کی دو وجہیں لکھی ہیں:

(۱) ارباب حکومت اپنے مشوروں کو خواہ وہ جادۂ صواب سے کتنے ہی بعید ہوں قبول نہ کرنے کی صورت میں قضاۃ سے انتہائی نازیبا سلوک کرتے ہیں،

(۲) اس منصب پر فائز ہونے کے بعد ہر خاص و عام اپنی مقصد براری اور حصول منفعت کی خاطر قضاۃ کی تملق اور خوشامد کرتا ہے۔[4]

حافظ سخاوی لکھتے ہیں:۔

زهد فی القضاء زهداً — وہ قضا سے بہت دامن بچاتے تھے،
تاما لکثرة ما توالی علیه من — کیونکہ اس میں بڑی مشکلات اور
الانکاد والمحن[5] — آزمائشیں ہیں،

ابن فہد مکی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر سب سے پہلے ۸۲۷ھ میں قاضی القضاۃ کے منصب پر مامور ہوئے، اور اسی سال ذی قعدہ میں اس سے گلو خلاصی حاصل کر لی، پھر رجب ۸۲۸ھ کو دوبارہ اس منصب پر فائز ہوئے اور ۸۳۳ھ تک رہے، پھر اس کو

[1] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۹ [2] لحظ الالحاظ ص ۳۳۰ [3] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۸
[4] البدر الطالع ج ۱ ص ۹۲ [5] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۸

چھوڑ دیا، جمادی الاولیٰ ۸۳۴ھ میں تیسری بار، شوال ۸۴۱ھ میں چوتھی بار،[1] محرم ۸۵۰ھ میں پانچویں بار اور ربیع الآخر ۸۵۲ھ میں چھٹی بار قاضی ہوئے،[2] درمیانی کچھ وقفوں کو چھوڑ کر ۸۲۷ھ سے ۸۵۲ھ تک برابر اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے، جمادی الثانی ۸۵۲ھ میں اس سے ہمیشہ کے لیے سبکدوشی حاصل کر لی،[3] اس کے بعد دار الحدیث الکاملیہ میں عزلت گزینی اختیار کر کے مستقل طور پر تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔[4]

آخر عمر میں اپنی ۲۱ سالہ مدت قضا پر سخت نادم اور ترساں رہتے تھے کہ معلوم نہیں وہ منصب کی کڑی آزمائشوں سے صحیح سلامت نکل سکے یا نہیں، فرمایا کرتے تھے انه جنی علی نفسه بتقلد امرهم . اور لم تبق فی بدنه شعرة تقبل اسمه،

ابن فہد مکی نے اخلاص و خیر خواہی کی بنا پر حافظ ابن حجر کے منصب قضا کو قبول کرنے پر سخت تنقید کی ہے، مگر اس منصب کو قبول کر لینا مصلحت خداوندی تھی، اس کے ذریعہ عوام کو بڑا فائدہ پہنچا، ہزاروں حقداروں کو ان کا حق ملا،

(باقی)

[1] لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ ص ۳۳۰ [2] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۲ ص ۱۰۴
[3] الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۸ [4] شذرات الذہب ج ۷ ص ۲۷۱

کتب خانہ عرفانیہ
کے
نادر مخطوطات

از جناب مولانا حکیم محمد عمران خاں صاحب بی اے، سیّد ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک راجستھان

مولوی حکیم قاضی محمد عرفان خاں، ناظم (صدر المفتیین) عدالت شریعت، ٹونک راجستھان اس علاقہ کے فاضل اور مشہور ترین افراد میں تھے، علمی قابلیت، فہم و ذکا، تفقہ فی الدین، جزئیات پر عبور، حق گوئی، پابندی شریعت میں آپ کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی، امراء کے درباروں میں علی الاعلان حق کا اظہار آپ کا شیوہ تھا، درس و تدریس میں اپنے استاد مولانا حکیم برکات احمد صاحبؒ کے بعد آپ مرکزی شخصیت کے مالک تھے، طالب علمی کے ابتدائی دور سے تدریس دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جو موت سے تین روز قبل تک جاری رہا، —— اسی درسی توغل اور علمی انہماک کی بنا پر کتابوں کے ذخائر سے ہمیشہ آپ کا رابطہ رہا، خود آپ کا ذاتی اور خاندانی کتب خانہ جس کے نوادر پر یہ مضمون سپرد قلم کیا جا رہا ہے، شخصی کتب خانوں میں سب سے بڑا کتب خانہ تھا، طلبہ کی ضرورت کے لحاظ سے درسی کتابوں کے کئی کئی مطبوعہ و قلمی نسخے آپ کے کتب خانہ میں رہتے تھے اور ان کو دیے جاتے تھے، نادر کتابوں کا ذخیرہ ان کے علاوہ تھا، جو ورثہ میں چلا آتا تھا، اس طرح یہ کتب خانہ ایک جامع کتب خانہ بن گیا۔

آپ کا خاندان ٹونک کے ممتاز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ ملا عرفان رامپوری صاحب وقار و مدار حواشی منار تحصیل علم کے لیے علاقہ سوات سے ہندوستان آئے اور بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور متاہل ہونے کے بعد رامپور میں سکونت اختیار کر لی، اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت عطا فرمائی کہ سات پشت گذر جانے کے بعد اب تک مسلسل اس خاندان میں علم و فضل باقی ہے، ذلک فضل اللہ۔

یہی ملا عرفان رامپوری اس کتابی ذخیرہ کے بھی مورث اعلیٰ ہیں، ان کے انتقال کے بعد یہ ذخیرہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوتا چلا گیا، اور اس میں اضافہ بھی ہوتا رہا، اس کی کچھ تفصیل اپنے مضمون "ٹونک کے قدیم مدارس اور کتب خانے" میں لکھ چکا ہوں جو معارف بابت جولائی تا ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے —— تقسیم در تقسیم کے بعد کتابوں کا جو ذخیرہ والد مرحوم کے حصہ میں آیا تھا، اس کے نوادر پر مضمون لکھنے کا وعدہ گذشتہ مضمون میں کیا تھا، یہ مضمون اسی وعدہ کا نتیجہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتب خانہ حدیث، فقہ، تصوف، صرف، نحو، منطق، فلسفہ اور طب کے اچھے ذخیرہ پر مشتمل ہے، کل کتابوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے، درسی کتابیں زیادہ تعداد میں ہیں، مثلاً شرح جامی کے ۹ نسخے، ہدایہ کے ۷، شرح وقایہ ۳، بخاری کے ۳، ابو داؤد کے ۲ وغیرہ وغیرہ۔ منطق و فلسفہ کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے، فقہ میں اس خاندان کو ہمیشہ سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، اس لیے فقہی ذخیرہ کافی تعداد میں ہے، کتب متداولہ فقہیہ کے علاوہ مختلف فتاویٰ خاصی تعداد میں ہیں،

"عوارف المعارف" اور "صحیح البخاری" کے نادر مخطوطوں کا تعارف اس سے

پہلے کے مضمون میں کرایا جا چکا ہے، اس مضمون میں دوسرے نوادر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مجموعہ حواشی تفسیر بیضاوی ۔ ۱۔ "حاشیہ سورۂ یٰسین" از ملا محمد صادق، محشی ۸ رمضان ۱۰۰۰ھ کو اس تحشی سے فارغ ہوئے۔ ملا صوفی بن ملا باقی کاتب نے سمرقند میں ۱۰۰۲ھ میں یہ نسخہ لکھا، تقریباً ۸ جزو کا رسالہ ہے، تقطیع خورد، کاغذ کرم خوردہ و قدرے چٹ زدہ،

آغاز: لک الحمد یا من منّ علینا بارسال الرسول الکریم۔ الخ

۲۔ حاشیہ سورۂ "انا فتحنا" از ملا عبد الحئی۔ تقریباً ۵ جزو کا رسالہ ہے۔

۳۔ ایضاً از مرزا جان شیرازی

۴۔ ایضاً از میر صدر الدین بخاری۔ مصنفہ ۹۹۱ھ

آخر الذکر تینوں حواشی کے کاتب محمد معصوم بن محمد باقی ہیں، ۱۰۱۱ھ میں یہ حواشی لکھے گئے ہیں، یہ چاروں حواشی ان ہی مقامات کے کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں، جہاں کے محشی تھے، مجموعہ حواشی قدیم اور نادر نسخہ ہے، ۴۲ جلوس میں یہ نسخہ عالمگیر کے شاہی کتب خانہ میں داخل ہوا، اور منعم خاں[1] خانخاناں کی تحویل میں رہا، ان کے قلم کا یہ نوٹ شروع میں درج ہے: "محرم الحرام ۴۲ عالمگیری تحویل محمد منعم"۔ مجموعہ کے آخری صفحہ پر متعدد عبارتیں محو شدہ ہیں، جو شاہی تحویلداروں کی معلوم ہوتی ہیں، مگر اس طرح مٹا دی گئی ہیں کہ پڑھی نہیں جاتیں، شروع میں مولوی فضل حق خطیب ٹونک کی مہر بھی ثبت ہے،

تفسیر پارۂ عم ۔ از احمد جنید و حاشیہ اش از ملا حنیف۔

اس تفسیر کے کاتب محمد حسین بن محمد علی یعقوبی ہیں، تاریخ کتابت درج نہیں،

---

[1] نواب منعم خاں خانخاناں سلاطین مغلیہ کے مشہور خوانین میں سے ہے، روح اللہ خاں میر بخشی کی معرفت عالمگیر کے دربار سے متعلق ہوا، عالمگیر اور اسکے بیٹے شاہ عالم دونوں کے زمانہ میں مناصب جلیلہ پر فائز رہا، مآثر الامرا میں اس کے مفصل حالات درج ہیں۔

گر نسخہ قدیم ہے، ورق اول ناقص ہے، اس تفسیر کے ساتھ ملا حنیف کا حاشیہ شامل ہے، اسکے کاتب دوست محمد بن یار محمد ہیں، یہ نسخہ کابل میں خواجہ ابو اسحق کے مدرسہ میں لکھا گیا، سنہ کتابت ۹ جلوس لکھا ہے، اور کوئی صراحت نہیں ہے، یہ نسخہ بھی قدیم ہے، اس کا ورق اول بھی ناقص ہے، اسی حالت میں یہ دونوں کتابیں شاہی کتب خانوں میں داخل ہوئیں، جیسا کہ مختلف تحویلداروں کے نوٹ سے اندازہ ہوتا ہے، چند مہریں بھی ثبت ہیں، لیکن محو شدہ ہیں،

رفع الحجاب عن الناسخ والمنسوخ من آی الکتاب ۔ شیخ محمد بن شیخ سلیمان الکردی المدنی المتوفی ۱۱۹۴ھ اس کے مصنف ہیں، مولانا شیخ خلفان ساکن صحار از بلد عمان کی فرمائش پر یہ رسالہ لکھا، مختصر رسالہ ہے۔ اور مصنف کی زندگی کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام درج نہیں، غالباً مصنف کے کسی شاگرد کے قلم سے ہے، اور اصل نسخہ سے مصنف کی موجودگی میں مقابلہ کیا گیا ہے، آخر میں یہ نوٹ درج ہے: "قوبلت مع المولف حفظہ اللہ تعالیٰ ومع نسختہ"۔ ۱۱۸۵ھ میں یہ نسخہ الیاس بن عثمان الکردی ثم المدنی کی ملک میں رہا، ۱۲۱۶ھ میں احمد بن حسین بن رشید کی ملکیت میں آیا، نسخہ نہایت معتبر اور نادر ہے، آغاز: الحمد للہ الذی لنسخ ظلام الشرک بنور الاسلام۔ الخ۔

تفسیر تبیان ۔ خضر بن عبد الرحمٰن زردی المتوفی [illegible] اس کے مصنف ہیں، پیش نظر نسخہ جمادی الاخری ۱۰۴۷ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام درج نہیں، چھوٹے سائز کے بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے، ورق اول چٹ زدہ اور ناقص ہے، تفسیر مدارک وغیرہ سے اس کتاب کی تحشی کی گئی ہے،

تفسیر حسینی ۔ ملا حسین واعظ کاشفی المتوفی ۹۱۰ھ کی مشہور تفسیر ہے، پیش نظر نسخہ کی جلد ثانی قدیم ہے، اگرچہ تاریخ کتابت درج نہیں ہے، مگر دوسرے شواہد سے دسویں یا گیارہویں

صدی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، آخر میں ایک مہر مدور محو شدہ ہے۔ آخر میں کتابت و کاغذ کے متعلق جو نوٹ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں رہا ہے، تقطیع متوسط مجدول آسمانی و طلائی، خط عربی۔

جمالین حاشیہ جلالین۔ مصنفہ ملا علی القاری المتوفی ۱۰۱۴ھ۔ پیش نظر نسخہ کے کاتب ملا لطف اللہ بن عبد اللہ سکھری ہیں، ۲۹ رجب ۱۲۲۹ھ کو کتابت شروع ہو کر ۱۲۳۴ھ میں ختم ہوئی، شروع میں مہر "میر نور علی" ثبت ہے، صاحب مہر نے ۱۲۳۲ھ میں اپنے قلم سے عبارت لکھی ہے، ۲ ذیقعدہ ۱۳۰۰ھ کو یہ نسخہ ٹونک میں قاضی عبد الحلیم صاحب کی ملکیت میں آیا۔

آغاز: الحمد للہ ذی الجلال والجمال والکمال۔ الخ

مصابیح السنۃ۔ پیش نظر نسخہ اگرچہ ناقص الطرفین ہے، لیکن نہایت قدیم ہے، چھٹی یا ساتویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، کاغذ دبیز اور کتابت قدیم ہے۔ اس کے ہر ورق سے قدامت ظاہر ہوتی ہے،

شرح مصابیح السنۃ (نصف آخر) شارح کا پتہ نہیں چل سکا۔ ربع ثالث کے بعد ۷۵۲ھ سنہ تصنیف درج ہے، کاغذ حنائی دبیز، خط عربی قدیم، شعبان ۸۲۲ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا، کاتب کا نام درج نہیں، نسخہ نہایت قدیم و نادر ہے اور تصنیف سے ستر سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ کتب خانہ میں صرف نصف آخر ہے، شرح میں ہر حدیث کے بعد "فیہ مسائل" کے تحت مسائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

شرح سفر السعادت۔ شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ۔ پیش نظر نسخہ نادر نسخہ ہے، کاتب محمد جعفر نے ۱۲ صفر ۱۰۹۴ھ کو اس کی کتابت کی، اوراق کی تعداد ۴۶۸ ہے، نسخہ قدیم اور بہتر حالت میں ہے، آخر میں "احمد اللہ ولد محمد امیر اللہ" کی مہر ثبت ہے، شروع میں

مولوی محمد مفتی ٹونکی کی مہر بھی ہے، جس میں "محمد مظہر اسرار عرفان ۱۲۴۴" کندہ ہے۔ ورق اول سے ایک مہر محو کر دی گئی ہے، شروع کتاب میں قاضی عبد الحلیم ٹونکی کے قلم سے محدث دہلوی کی تصانیف کی فہرست شامل ہے، جن کی تعداد ۴۳ ہے۔

اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ للمحدث الدہلوی۔ پیش نظر نسخہ صرف نصف آخر ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، کاتب فقیر محمدی ہیں، جلد اول کے اختتام پر ۱۰۹۷ھ سنہ کتابت درج ہے، جلد آخر کی ابتدا میں قاضی بدر الدین بن قاضی بدیع الدین احمد فاروقی کے دستخط اور مہر ثبت ہیں، مہر میں ۱۱۲۴ھ کندہ ہے۔

صحیح البخاری۔ اس نسخہ کے کاتب علامہ معین بن محمود کشمیری المتوفی ۱۰۸۵ھ ہیں۔ اس نسخہ پر ایک مفصل مضمون علیحدہ لکھا جا چکا ہے، جو معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکا ہے،

شمائل الترمذی۔ اس نسخہ کے کاتب حاجی نصر اللہ البخشی الباتنی ہیں، ذیقعدہ ۹۶۷ھ میں کتابت ہوئی، نسخہ اچھا اور کثیر المحشی ہے، ۱۲۴۴ھ میں یہ نسخہ مولوی سعد اللہ خطیب جامع مسجد ٹونک کے قبضہ میں آیا، درمیان سے قدرے ناقص تھا، ورق اول بھی کم تھا، موصوف نے اسے مکمل کیا ہے۔

شرح شمائل نبویؐ۔ محمد جان بن محمد صدیق بن سلطان محمود نقشبندی تاشکندی اس کے مصنف اور خواجہ نور اللہ بن خواجہ جمال اللہ نقشبندی کاتب ہیں، تاریخ کتابت درج نہیں۔ شروع میں مہر "محمد فیض" ثبت ہے، مولوی فضل حق خطیب ٹونک کی مہر بھی لگی ہوئی ہے،

آغاز: حمد ابدی و ثنائی لم یزلی و شکر بے عدد و سپاس بے حد۔ الخ

الحصن الحصین للجزری۔ اس نسخہ کے کاتب شیخ نعمت اللہ بن شیخ سلیمان ہیں، ۱۱ جمادی الآخری ۱۰۷۴ھ

تاریخ کتابت ہے، نسخہ اچھا اور کثیر المحشی ہے،

لباب الاخبار۔ اس میں مختلف ابواب کی دس دس احادیث جمع کر کے فارسی میں انکا ترجمہ کیا گیا ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ لیکن ۲۰ رمضان ۱۰۹۶ھ تاریخ کتابت درج ہے، اول و آخر میں مولوی سعد اللہ و مولوی فضل حق کی مہریں ثبت ہیں، ایک مدور مہر محو شدہ ہے۔

آغاز: حمد بیحد و ثنا بیعد مر خدائے را عزوجل۔ الخ

روضۃ الخطباء و مغنم الاتقیاء۔ جمعہ کے خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب عمر خاں بن محمد عارف عبد الغفور جمال ...... المدنی موطناً والدر وانی الفقتنی مولداً ہیں، کتاب خانہ میں اس کی صرف جلد ثانی ہے، وہ بھی آخر سے ناقص ہے، یہ جلد ماہ شعبان کے خطبوں سے شروع ہو کر آخر تک ہے، آخر کے تقریباً ۸ خطبے کم ہیں، شروع میں دونوں جلدوں کی فہرست شامل ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد اول ۱۱۵ اور جلد ثانی ۲۲۳ خطبوں پر مشتمل ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب خطبات کا اچھا مجموعہ ہے، اور خطبے علمی انداز کے ہیں، شیخ احمد ابن محمد جمال صادق نے کسی زمانہ میں یہ کتاب کہیں وقف بھی کی تھی، جیسا کہ ابتدا کے نوٹ سے پتہ چلتا ہے۔

جامع الرموز شرح مختصر الوقایۃ مصنفہ شمس الدین محمد القہستانی المتوفی ۹۶۲ھ

یہ نسخہ ۹۷۷ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب ابو بکر بن شیخ یوسف زلی ہیں، کتابت کی تکمیل اگرچہ ۹۷۷ھ میں ہوئی ہے، لیکن اس کا اکثر حصہ شارح کی حیات کا لکھا ہوا ہے، اس لیے کہ وسط کتاب کے بعد تک جس قدر حواشی ہیں اُن سب پر کاتب نے "منہ سلمہ اللہ وابقاہ" لکھا ہے، نسخہ بہت عمدہ، نادر اور قدیم ہے۔

الایضاح شرح الاصلاح للوقایہ۔ مصنفہ احمد بن سلیمان بن کمال مروی مشہور بہ

ابن کمال پاشا، المتوفی ۹۴۰ھ۔ اس نسخہ کے کاتب خان محمد بن شیخ فتح محمد انصاری ساکن ملتان ہیں، ۱۲ر شوال ۱۰۹۵ھ تاریخ کتابت ہے، آخر سے تین مہریں محو شدہ ہیں، ایک مہر پر صاحب مہر کی طرف سے یہ عبارت درج ہے: "مالکہ بالشراء خادم العلماء ملا موسیٰ ولد غفران پناہ حاجی علی مرحوم"۔ نسخہ اچھا ہے،

منح الغفار شرح تنویر الابصار۔ مصنفہ محمد بن عبد اللہ التمرتاشی جو شارح بھی ہیں اور ماتن بھی، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، پیش نظر نسخہ صرف جلد اول ہے، جس کے کاتب حافظ محمد بن علی ہیں، ۲۴ر شعبان ۱۰۹۸ھ تاریخ کتابت ہے، اول و آخر سے کئی مہریں محو شدہ ہیں، نسخہ قدیم اور نہایت بہتر حالت میں ہے، ۱۱۲۲ھ میں یہ نسخہ مکہ معظمہ سے خرید کر ہندوستان منتقل ہوا، ابتداءً اس کی جلد مصری تھی، ۱۲۳۰ھ میں اس کی بہترین جلد مختار الدولہ محمود خاں نے تیار کرائی، جو ٹونک کے ایک نامور رئیس اور صاحب کتب خانہ تھے، اس کتاب کی جلد ثانی بھی غالباً ٹونک کے ایک شخصی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

بستان العارفین۔ للفقیہ ابی اللیث المتوفی ۳۷۳ھ۔ پیش نظر نسخہ قدیم اور اچھا نسخہ ہے، چھٹی یا ساتویں ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، چونکہ ناقص الطرفین تھا اسلیے اول و آخر کے چند اوراق بعد میں کسی نے لکھکر شامل کیے ہیں، یہ نسخہ شیخ عبد الرسول کے کتب خانہ کا تھا، وہاں سے ان کے بھائی عنایت اللہ بن شیخ شہاب الدین نے خریدا، موصوف کی مہر ثبت ہے، جس میں ۱۰۹۳ھ کندہ ہے، اول آخر میں "محمد اعظم ۱۱۱۲" اور "عصمت اللہ عباسی الہاشمی" کی مہریں بھی ثبت ہیں، محمد غوث ہاشمی کی ملک میں بھی یہ نسخہ رہا ہے۔

فتاوی مجمع البرکات۔ مصنفہ ابو البرکات بن حسام الدین بن مولانا جمال نعمان در ۱۱۱۰ھ

اس نسخہ کے کاتب عبد الواحد القادری ہیں، ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۲۲ھ تاریخ کتابت ہے، اول و آخر میں تین مہریں "ملا عبد البر ولد عنبر خاں" کی ثبت ہیں،

نور النیرین فی اختلاف المذہبین (ابی حنیفہ والشافعی)۔ للشیخ علی الہیثمی) اس نسخہ کے کاتب یحییٰ بن حسین بغدادی ہیں، محرم ۱۰۷۶ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا، عبد القادر بن محمد علی القادری کی ملک میں بھی یہ نسخہ رہا ہے،

آغاز: الحمد للہ الذی رفع اعلام الشریعۃ الغراء۔ الخ

فتاویٰ قاضی خاں۔ مشہور کتاب ہے، پیش نظر نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، جلد اول کا اکثر حصہ قاضی میاں سلیمان ولد گل محمد کا لکھا ہوا ہے، لوح کتاب پر ابتداء کتابت کے سلسلہ میں ذیل کا تاریخی قطعہ درج ہے:

روز اربعا بعد ہم بود از ربیع الاولین — من شروع کردم بقول آں شفیع المذنبین

یکہزار و یکصد و چہل ہفت سن اندر حساب — تا نویسم با مداد و با دل و جان ایں کتاب

آخر کے سات آٹھ جزو کاتب مذکور کے بھائی ملا حسین نے لکھے، جس کی تاریخ کتابت ۱۰ ربیع الآخر ۱۱۵۰ھ ہے، اول و آخر میں ان کی مزید عبارتیں اور حواشی بھی درج ہیں، جو ۱۱۸۰ھ تک کے ہیں، آخر میں اس خاندان کے کچھ لوگوں کی تاریخہائے وفات درج ہیں، ان میں محمد حسین مذکور کی تاریخ وفات ۵ محرم ۱۱۸۱ھ روز جمعہ تحریر ہے، تقطیع کلاں اور نسخہ اچھا ہے، اس کتاب کی جلد دوم مولوی فضل حق صاحب خطیب ٹونک نے ۱۲۷۱ھ میں اپنے کسی کاتب سے لکھوائی ہے۔

ضوء السراج شرح سراجی۔ مصنفہ ابو العلی محمود بن ابی بکر بن ابی العلی بخاری کلاآبادی، پیش نظر قدیم اور اچھا نسخہ ہے، لیکن آخر سے ناقص ہے، ۱۰۲۸ھ میں یہ نسخہ

نواب ہادی خاں[1] اکبرآبادی المخاطب بہ فضائل خاں کے قبضہ میں آیا، اس کے شروع میں ان کے قلم سے ایک نوٹ ہے، جس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا، ان کی مدور مہر بھی ثبت ہے، لیکن وہ محو کر دی گئی ہے، مذکورہ نوٹ کا ما یقرأ حصہ حسب ذیل ہے:

"شرح سراجی فرائض مسمی بضوء السراج بندہ محمد ہادی حسینی در بلدہ اکبرآباد در ۱۱۰۲ھ"

اس کے علاوہ کتاب کے شروع میں ایک چھوٹی مہر "خصیم ۱۱۹۹" ثبت ہے، جس میں مذکورہ اعداد کندہ ہیں، اور اوپر قلم سے "فقیر" لکھا ہوا ہے، غالباً یہ مہر کسی تحویلدار کی مہر ہے جو علامت کے طور پر اس طرح ثبت کی جاتی تھی، اس لیے کہ یہی مہر اس کتب خانہ کی دوسری چند نادر اور قدیم کتابوں پر بھی ثبت ہے، نسخہ اچھا ہے، مگر ناقص اور مرمت شدہ ہے۔

معدن الحقائق شرح کنز الدقائق۔ محمد بن حاجی بن محمد الحسنی السمرقندی کی تصنیف اور کنز کی مشہور شروح میں ہے، ۱۵ ربیع الاول ۱۱۱۳ھ م ۴۵ جلوس عالمگیری میں یہ نسخہ حیدرآباد میں مکمل کیا گیا، اصل نسخہ اس سے بھی زیادہ قدیم ہے، لیکن ناقص الطرفین تھا، بعد میں تکمیل ہوئی (۸۸۰) صفحات پر مشتمل ہے، شروع کی چار مہریں محو شدہ ہیں، مہروں کے ساتھ جو عبارتیں ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں رہا ہے، ورق اول پر ایک نوٹ درج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ "محمد مقیم"[2] کی تحویل میں بھی رہا ہے۔

---

[1] شاہان مغلیہ کے مشہور امراء میں اور عالمگیر کے بیٹے محمد اعظم کے مقربین میں تھے، اس نے اس کو "فضائل خاں" کا خطاب دیا تھا، عالمگیر نے ان کو قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا تھا، مدت کے بعد رہا کیا گیا مگر اکبرآباد سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی، پھر ایک زمانے کے بعد ان کو اپنا منشی بنا لیا، کتب خانہ کی نگرانی کی اور دوسری خدمات بھی انکے سپرد تھیں، وہ اکثر علوم و فنون میں کمال رکھتے تھے، ۱۱۲۴ھ میں انتقال ہوا (نزہۃ الخواطر بحوالہ مآثر الامراء)

[2] محمد مقیم بن محمد جعفر بن محمد قلی خراسانی المخاطب بہ نواب ابو المنصور خاں صفدر جنگ، برہان الملک محمد امین نیشاپوری کے بھانجے اور داماد تھے، اودھ کے حاکم رہے، ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ کے زمانہ میں وزارت کا عہدہ ملا، ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی۔ (ایضاً)

عنوان الشرف الوافی فی الفقہ والنحو والتاریخ والعروض والقوافی } شرف الدین اسمٰعیل بن ابی بکر احمد المقری الشہیر بابن الیمنی المتوفی ۸۳۷ھ کی مشہور اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے، صاحب کشف الظنون وغیرہ نے اس کتاب کی خصوصیات مفصل ذکر کی ہیں، اور واقعی میں یہ کتاب اپنے طرز کی پہلی اور عجیب تصنیف ہے، صنعت توشیح میں لکھی گئی ہے، اصل کتاب علم فقہ میں ہے، لیکن ہر سطر میں چند حروف جدول کے طور پر سرخ لکھے گئے ہیں، ان حروف کو ملا کر پڑھا جائے تو مستقل ایک رسالہ بنجاتا ہے، اس طرح ان جدولی حروف کے ذریعہ مختلف فنون کے مستقل چار رسالے علٰحدہ سے ترتیب دیے گئے ہیں، کتاب کی ترتیب سے مصنفِ کتاب کی مہارت، قابلیت اور زبان پر پوری قدرت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ کتاب اگرچہ ہندوستان میں ایک بار طبع ہوچکی ہے، لیکن کمیاب اور نایاب ہے، پیش نظر نسخہ قلمی مولوی فضل حق صاحب خطیب جامع مسجد ٹونک نے ۱۲۷۹ھ میں لکھایا۔

ملہم الغیب - یہ کتاب بھی "عنوان الشرف" کے طرز پر صنعت توشیح میں لکھی گئی ہے، اور ایک ہندوستانی فاضل محمد شریف کنبو کی تصنیف ہے، جہانگیر کے دور میں تصنیف ہوئی، اصل کتاب فقہ میں ہے، اور صنعت توشیح میں چار رسالے فن صرف، نحو منطق اور مناظرہ کے ترتیب دیے گئے ہیں، خدابخش خاں نے بھی اپنی فہرست "محبوب الالباب" میں اس کا ذکر کیا ہے، پیش نظر نسخہ مولوی فضل حق صاحب خطیب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

آغاز: الحمد للہ حری الحمد علی ابتدائہ و انعامہ العمیم - الخ

التصریح حاشیہ تلویح معہ حاشیہ عبدالحکیم } تصریح، علامہ خالد بن عبداللہ الازہری المتوفی ۹۰۵ھ کی تصنیف ہے، پیش نظر نسخہ قدیم ہے، تاریخ کتابت

اگرچہ ذکر نہیں لیکن اول سے آخر تک جو حواشی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ شارح کی حیات کا لکھا ہوا ہے۔ حاشیہ کی ہر عبارت پر کاتب نے "منہ سلمہ اللہ" تحریر ہے، کاغذ اور کتابت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اسی دور کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

اسی کے ساتھ حاشیہ عبدالحکیم سیالکوٹی بر تلویح بھی شامل ہے جو ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ کو بزمانہ عالمگیر یہ حاشیہ برخوردار ولد شیخ محمود نے لکھا۔ ۱۰۹۹ھ میں محمد فخرالدین نے یہ نسخہ خریدا۔ شروع میں ذیل کی دو مہریں ثبت ہیں:

(۱) "حافظ محمد سلطان" (۲) حافظ محمد سلطان ولد حافظ محمد تقی" دو مہریں مزید محو شدہ ہیں۔

آغاز - حامداً لمن انزل کتابہ الحکیم - الخ

التلویح حاشیہ توضیح شرح تنقیح :- علامہ تفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ کی مشہور تصنیف ہے، پیش نظر نسخہ پر اگرچہ تاریخ کتابت درج نہیں لیکن قدیم اور نادر نسخہ ہے۔ کاتب کا نام نصراللہ بن عمر بن سعداللہ ہے۔ (۲۴۵) اوراق پر مشتمل ہے۔ اول و آخر میں متعدد مہریں ثبت ہیں لیکن پڑھی نہیں جاتیں۔ کہیں کہیں مہر کے ساتھ "عرض دیدہ شد" بھی تحریر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی کتب خانوں میں یہ نسخہ رہا ہے۔ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے مشہور عالم میرزاہد ہروی اور قاضی محمد پناہ جونپوری کی ملکیت میں رہا ہے۔ ورق اول پر تحریر ہے:

"ملکہ العبد الاحقر میرزاہد[1] عفی عنہ"

---

[1] قاضی محمد زاہد ہروی ابن قاضی محمد اسلم ہروی المتوفی ۱۱۰۱ھ ہندوستان کے مشہور عالم اور صاحب تصانیف متداولہ ہیں۔

اس کے بعد دوسرا نوٹ درج ہے جس کا بقیہ حصہ ذیل میں لکھا جاتا ہے :۔

"تم وقع بالشمرار الصیحح الشرعی فی ملک عبدہ . . . . . الی رحمۃ اللہ محمد پناہ[1] بن امان اللہ عفی عنہما"

بہر حال پیش نظر نسخہ عمدہ، قدیم، محشی اور تصحیح شدہ ہے۔ البتہ امتداد زمانہ سے کاغذ بوسیدہ ہوگیا ہے۔

حاشیہ معالم الدین ۔ ملا محمد صالح بن احمد مازندرانی ۔

اچھا نسخہ ہے۔ کاتب کا نام محمد معصوم قاضی ہے ۔ محرم ۱۰۸۲ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا۔ ۳۵۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔

آغاز : نحمدک اللھم یا من خلقنا ولم نک شیئا مذکوراً ۔ الخ

خزانۃ الغرائب شرح حسامی ۔ شارح کا پتہ نہیں چل سکا۔ مگر متقدمین میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ مفصل شرح ہے اور ہر ہر لفظ پر قیل وقال ہے "فیہ بحث"، "فیہ نظر" لکھکر پوری بحث کی گئی ہے، پیش نظر نسخہ صرف ابتدائی چند اجزاء پر مشتمل ہے۔ ورق اول بھی ناقص ہے جس کی بنا پر مزید تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں۔ رسم کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم نسخہ ہے۔ مقدمہ سے وجہ تسمیہ کی کچھ عبارت نمونۃً درج ہے :۔

"وسمیتہ لاشتمالہ علی الفوائد العجیبۃ واللطائف الغریبۃ خزانۃ الغرائب متوقعا من الاخوان والاقران ومن افاضل العصر والزمان"

شرح مسلم الثبوت ۔ شارح کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ پیش نظر نسخہ کے کاتب محمد اکمل ہیں بن

---

[1] قاضی محمد پناہ جونپوری۔ جونپور کے مشہور عالم ہیں۔ نادر شاہ نے ان کو علمی تحقیقات کے صلہ میں "مستعد خان" کا خطاب دیا تھا۔ محمد شاہ نے جونپور کا قاضی مقرر کیا وہیں انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر)

اوران کے قلم سے ایک نوٹ شروع میں درج ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۵ شعبان ۱۱۹۰ھ کو یہ شرح تصنیف ہوئی۔ ۱۳۳۹ھ میں کاتب نے مصنف کے اصل مسودہ سے یہ مبیضہ تیار کیا، اس وقت شارح کا انتقال ہوچکا تھا۔ مذکورہ نوٹ درج کیا جاتا ہے :۔

"ابتداء تصنیف ہذا الشرح الموجب للفرح فی الخامس والعشرین من شعبان سنۃ الف ومایۃ وثمانین من الہجرۃ المقدسۃ وابتداء نقلہ فی اول المرۃ من خط مصنفہ فی تاسع عشر من ربیع الاول سنۃ الف ومائتین وتسعۃ وثلثین من الہجرۃ النبویۃ . . . . . . وکاتبہ اضعف عباد اللہ الاجل محمد المدعو باکمل عفی عنہ ذنوبہ بکمال لطفہ"

آخر میں ختم کتابت کی عبارت یہ ہے ۔

"الی ہنا الشرح تم ومن الرقم سکن القلم واستراح الشارح طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ، کتبتہ من خط مولفہ وتابعت بحق مقابلتہ وانا اضعف عباد اللہ الاجل محمد المدعو باکمل . . . . . . "

اصل کتاب کی ابتدائی عبارت اس طرح ہے :۔

"الحمد للہ رب العالمین . . . . الحمد للہ قال المصنف فی الحاشیۃ قالوا ہذہ الجملۃ تحتمل ان یکون انشائیۃ لان المقام مقام انشاء الحمد" الخ

درمیان کے کچھ حصہ کا نمونہ یہ ہے۔ متن کی عبارت "امابعد فیقول الشکور العبد محب اللہ بن عبد الشکور" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فی الحاشیۃ، الوصف الاول کانہ بالارث . . . . . . والوصف الثانی کانہ بنفسہ . . . . وقد اشتہر بین الطلبۃ ان المصنف

ارسل هذا الکتاب الی استاذ العالم النحریر والذکی الخبیر الشیخ قطب الدین الانجهی
الشهیر بالشمساآبادی، فلما رأی هذه العبارة قال ما فعل هذا الرجل قد جعل
اباه عبد الله"

کوشش کے باوجود مجھے شارح کا پتہ نہ چل سکا اس لئے اس پر تفصیلی نوٹ لکھا نہ
مناسب معلوم ہوا تاکہ اس شرح کی تفصیل معلوم ہوجائے اور شاید اہلِ علم میں سے کوئی
صاحب اس کا پتہ چلا سکیں۔

تعلیق الانوار فی اصول المنار:۔ لابن نجیم المصری المتوفی ۹۷۰ھ۔

پیش نظر نسخہ چونکہ آخیر سے ناقص ہے اس لیے تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ورق
اول پر چند مہریں علماء کے قلم کی عبارتیں درج ہیں لیکن پڑھی نہیں جاتیں۔ البتہ ایک عبارت
کے ساتھ ۱۰۵۱ھ تحریر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اس سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔
ممالک عربیہ میں لکھا گیا ہے۔ ۱۲۶۰ھ میں مولوی عبدالحق ابن مولانا خلیل الرحمن گلشن آبادی
حج کو تشریف لے گئے تو مکہ معظمہ سے یہ نسخہ ساتھ لائے۔ اول و آخر میں انکی مہریں ثبت ہیں نسخہ
اچھا ہے۔ ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اول سے آخر تک محشّی ہے۔

دوار الاصول حاشیہ دائر شرح منار:۔ مصنفہ ملا عرفان رامپوری۔ پیش نظر نسخہ
شارح کے قلم کا لکھا ہوا اصل نسخہ ہے۔ موصوف احقر کے جد امجد تھے اس لئے یہ نسخہ آبائی
کتب خانہ میں محفوظ رہا۔ شروع میں مصنف کی مہر "زفضل سبحان شد محمد عرفان" ثبت ہے۔
اس حاشیہ کا ایک نسخہ کتب خانہ رامپور اور ایک نسخہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں
محفوظ ہے۔ یونیورسٹی والا نسخہ مولوی عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ کے ساتھ
وہاں منتقل ہوا۔ مولوی عبدالحلیم صاحب نے نور الانوار کے حاشیہ قمر الاقمار میں کہیں کہیں

اور کہیں توثیقاً ملا عرفان رامپوری کے اسی حاشیہ کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ حاشیہ مذکور کا
یہ نسخہ موصوف کے کتب خانہ میں محفوظ تھا۔

شرح عقائد النسفی:۔ پیش نظر نسخہ اس کتاب کا قدیم اور اچھا نسخہ ہے۔ حضر بن
حسن البلخی اس کے کاتب ہیں۔ ۸ ذی الحجہ ۹۶۹ھ تاریخ کتابت ہے۔ نسخہ عمدہ اور
نادر ہے اول سے آخر تک محشی ہے۔ شروع سے ایک مہر محو شدہ ہے۔ مولوی سعد اللہ
خطیب کی مہر بھی ثبت ہے۔

حاشیہ شرح عقائد للخیالی:۔ احمد بن موسیٰ الخیالی شاگرد ابن شریفیہ فدوی
المتوفی ۸۶۲ھ محشی ہیں۔ یہ نسخہ اخیر سے ناقص ہے لیکن قدیم نسخہ ہے۔ غالباً مذکورہ شرح
سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اوّل سے آخر تک کثیر الحشی ہے۔

المسامرہ فی شرح المسائرہ۔ متن کے مصنف محمد بن عبد الواحد بن عبد الحمید
کمال الدین بن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ ہیں۔ اس کی شرح ان کے شاگرد کمال الدین
محمد بن محمد ابی بکر معروف بہ ابن ابی الشریف المتوفی ۹۰۵ھ نے کی ہے۔ کتاب اچھی ہے
اس نسخہ کے کاتب غلام حسین بن درویش محمد بن جیون اور سنہ کتابت ۱۲۴۷ھ ہے۔
آغاز:۔ حمداً لمن رسم علی صفحات الکائنات دلائل توحیدہ۔ الخ

العروۃ الوثقی:۔ مولانا کمال الدین سہالوی المتوفی ۱۱۷۵ھ کی تصنیف ہے۔
کاتب نے اگرچہ اپنا نام و تاریخ کتابت نہیں لکھی ہے مگر یہ نسخہ مصنفِ علام کی حیات کا
لکھا ہوا ہے۔ جس کی تصریح کاتب نے کر دی ہے۔ حواشی سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ آخر
ایک مہر محو شدہ ہے۔ آخر میں یہ عبارت بھی درج ہے:۔
"مالک ہذا الکتاب گنہگار امیدوار رحمت پروردگار مزمل غفر اللہ لہ و للوالدین و احسن الیہما"

صحائف :- مصنفہ المولی محمد آفندی رومی بن علی دیار بکری المتوفی ۹۴۵ھ
مجمع المعارف کا متن یہی صحائف ہے ۔ یہ نسخہ اگرچہ ناقص الطرفین ہے لیکن اچھا نسخہ ہے۔
مجمع للمعارف سے اس کی تحشی کی گئی ہے ۔ عمدہ اور قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے ۔

النواقض فی الرد علی الروافض :- الولی بن السید الشریف معین الدین الشہیر
بمیرزا مخدوم الجرجانی ثم الشیرازی المتوفی ۹۹۵ھ کی تصنیف ہے "نواقض" اس کا
تاریخی نام ہے ۔ سلطان مراد خان کے عہد میں شیعوں کی تردید میں یہ کتاب تصنیف ہوئی
بیش بہا نادر نسخہ، اس کا عمدہ نسخہ ہے ۔ تاریخ کتابت اگرچہ درج نہیں لیکن شروع میں ایک
مہر محو شدہ ثبت ہے ۔ جس کے بالائی حصہ میں عالمگیر پڑھنے میں آتا ہے ۔ اس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بادشاہ عالمگیر کے کسی خانہ زاد یا تحویلدار کی تحویل میں رہا ہے ۔ تقطیع
چھوٹی خط صاف اور واضح ہے ۔

آغاز :- نحمدک اللھم لا الہ الا انت وحدک لا شریک لک الیک المصیر ۔ الخ

شرح فصوص الحکم :- شارح شیخ محب اللہ الہ آبادی المتوفی ۱۰۵۸ھ بیش نظر
نسخہ میر سعید محمد زمان جیو کے لیے ۔ اورنگ زیب کے عہد میں لکھا گیا ۔ تاریخ کتابت
۲۴ جمادی الاخری ۴۰ سنہ جلوس مطابق ۱۱۰۷ھ ہے ۔ یہ نسخہ نواب محمد سعید خان
بہادر ساکن سرونج مالوہ کے کتب خانہ کا ہے ۔ ۱۳۱۴ھ میں مولوی فضل حق صاحب
خطیب کو وہاں سے حاصل ہوا ۔

عوارف المعارف :- کتب خانہ میں عوارف المعارف کے دو اچھے نسخے ہیں
ایک نسخہ قدیم تر ہے ۔ جس پر ایک مفصل مضمون معارف بابت ماہ جون ۱۹۶۶ء میں
شائع ہو چکا ہے ۔ دوسرا نسخہ بھی اچھا ہے ۔ اس کے کاتب محمد اشرف ہیں ۔ ۱۱ رجب ۱۱۱۷ھ کو

اکبرآباد میں یہ نسخہ لکھا گیا ۔ اس کتاب کے اول و آخر میں بھی مہر "خصیم ۱۱۹۰ ۱۲۳۲" ثبت ہے
اور اس کے ساتھ "فقیر" لکھا ہوا ہے ۔ یہی مہر "ضوء السراج" پر بھی ثبت ہے ۔
جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، شروع میں مہر "بندہ درگاہ غلام شاہ" بھی ثبت ہے ۔ ایک مہر محو شدہ
بھی ہے ۔

سلوک العارفین و رسالہ ماکول و مشروب :- مصنفہ مولوی سراج احمد
ابن محمد مرشد بن مولوی ارشد المتوفی ۱۲۳۰ھ تذکرہ کاملان رامپور میں ان کے مفصل
حالات موجود ہیں ۔ صاحب تصانیف ہیں ۔ پیش نظر دونوں نسخوں پر اگرچہ تاریخ
کتابت اور کاتب کا نام نہیں ہے ۔ مگر یہ نسخے مصنف کے پاس رہ چکے ہیں ۔ شروع
میں ان کی مہر "سراج احمد ولد محمد مرشد" ثبت ہے ۔ مولوی فضل حق صاحب خطیب نے
۱۲۹۹ھ میں یہ نسخہ سرونج میں غلام قادر خان کے کتب خانہ سے خریدا ۔

مرصاد العباد :- کاتب محمد عالم بن حبیب اللہ بن تاج الدین ساکن تجارۃ
علاقہ شاہجہان آباد ۔ ۲۰ جمادی الاخری ۱۰۱۶ھ تاریخ کتابت ہے ۔ یہ نسخہ عطاء اللہ بن
محمد اسمٰعیل کی ملک میں رہا ہے ۔ ان کی ایک خوبصورت مہر "عطاء اللہ ولد محمد اسمٰعیل
ابن ابوالبرکات بن محمد یوسف تجاری" شروع میں ثبت ہے ۔ (۲۱) جزو پر مشتمل ہے ۔

آغاز :- الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی نبیہ ۔ الخ

نتیجۃ الاولیاء :- یہ رسالہ بھی مذکورہ کتاب کے ساتھ شامل ہے اور اسی
دور کا لکھا ہوا ہے ۔ ۷ جزو پر مشتمل ہے ۔ آخر میں عطاء اللہ کی مذکورہ مہر ثبت ہے تصوف
عبداللہ تمیم انصاری بھی اس کے شامل ہے ۔

رسالہ قشیریہ :- کاتب نے اگرچہ اپنا نام اور تاریخ کتابت نہیں لکھی، مگر

پیش نظر نسخہ اچھا نسخہ ہے، اور گیارہویں یا بارہویں صدی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ درمیان سے کرم خوردہ ہوگیا ہے۔

مثنوی مولانا روم :- چھوٹے سائز پر مثنوی کا بہترین نسخہ ہے، اول سے آخر تک مجدول طلائی اور نہایت خوشخط ہے۔ لیکن امتداد زمانہ سے کاغذ بوسیدہ ہوگیا ہے۔ ناقص الطرفین ہے۔ درمیان میں ایک دفتر کے اختتام سے اس کا سنہ کتابت ۱۰۳۱ھ معلوم ہوتا ہے۔

(دارالمصنفین کی ایک نئی کتاب)

مقالات عبد السلام

مولانا عبد السلام ندوی مرحوم نے اسوۂ صحابہ، شعر الہند، انقلاب الامم اور اقبال کامل جیسی گرانقدر کتابوں کے علاوہ سیکڑوں علمی و فقہی و تاریخی و تنقیدی و ادبی اور فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں، اور شعراء کے دواوین اور بعض اہم کتابوں پر طویل تبصرے بھی کیے ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے مضامین کے مجموعوں کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی دار المصنفین کے پیش نظر ہے، یہ کتاب مرحوم کے چند اہم ادبی و تنقیدی مضامین اور خطبوں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے زبان و ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے اور ملک سے داد حاصل کی۔

منیجر

تلخیص و تبصرہ

"تخت طاؤس"

ہندوستان کا مشہور تخت طاؤس نادر شاہ اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا، وہاں جانے کے بعد اس کی تاریخ تاریکی میں ہے، اس کے متعلق مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں، ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایران کا موجودہ تخت طاؤس وہی شاہجہانی تخت طاؤس ہے، ایک ایرانی اہل قلم یحییٰ ذکا نے ایران کے ایک رسالہ "ہنر و مردم" کے اکتوبر ۱۹۶۷ء کے پرچے میں "تاج و تختہای سلطنتی ایران" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس خیال کی تردید کی ہے، اور ایران کے موجودہ تخت طاؤس کی تاریخ تحریر کی ہے، ذیل میں اس کی تلخیص دیجاتی ہے۔

سلطنت ایران کے موجودہ مرصع و زرنگار تخت طاؤس کے متعلق ناواقفوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ یہ شاہجہانی تخت طاؤس ہے، جو نادر شاہ اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا، جو سراسر غلط ہے، اس غلط فہمی کا ایک سبب تو دونوں میں ناموں کا اشتراک ہے، دوسرے شاہجہانی تخت طاؤس کی تاریخ تاریکی میں ہے، ایران کے موجودہ تخت طاؤس کی تاریخ معلوم ہوجانے کے بعد یہ غلط فہمی دور ہوجاتی ہے اور یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ایران کے موجودہ تخت طاؤس سے جس کو پہلے تخت خورشید کہا جاتا تھا، اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

نادر شاہ دلی فتح کرنے کے بعد جنگ کے ساز و سامان، مال غنیمت اور محمد شاہ کے

ہدیے وتحائف ضرور لایا تھا لیکن اس کے ساتھ نہ تو تخت طاؤس تھا اور نہ کوئی اور تخت جیسا کہ اس کے ایک معاصر انگریز سیاح "جوناس ہانوی" کی ۱۱۵۲ھ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے،

ہندوستان کے بیش قیمت تخت طاؤس کو بنانے میں وہاں کے ماہرین زرگروں اور جواہر سازوں نے پورے سات برس صرف کئے تھے، اس میں قسم قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے، اور نہایت مزین و آراستہ تھا، شاہجہاں کے عہد ۱۰۴۳ھ میں یہ بنکر مکمل ہوا تھا، اس کے گنبد پر مور کی دو شکلیں نصب تھیں، اس لیے یہ تخت طاؤس کے نام سے مشہور ہوا۔

نادر شاہ نے ہندوستان سے واپسی کے بعد ایرانی اور ہندوستانی جواہر سازوں اور کاریگروں کو جو اس کی فوج میں تھے، جواہرات سے آراستہ ایک اور تخت بنانے اور اس کا نام تخت نادری رکھنے کا حکم دیا تھا بعض مورخین لکھتے ہیں کہ نادر شاہ جمادی الثانی ۱۱۶۰ھ میں قوچان سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر فتح آباد میں قتل کر دیا گیا، اور تخت نادری و تخت طاؤس دونوں خراسان کے کردوں کے ہاتھ لگ گئے، انھوں نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں تقسیم کر لیا، مسٹر فریزر نے اپنی کتاب "خراسان" میں لکھا ہے کہ ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء میں میری ملاقات ایک معمر کرد سے ہوئی تھی، اس کا بیان ہے کہ "نادر شاہ کے مارے جانے کے بعد مروارید جادر اور تخت طاؤس ہمارے خاندان کے بعض روسا کو مل گئے، انھوں نے اس مال غنیمت کو تقسیم کر لیا" اس کا ایک حصہ اس کردی کو بھی ملا تھا۔" لیکن فریزر کا یہ بیان بعض دلائل کی بنا پر صحیح نہیں ہے، اولاً تو یہ سوال کہ نادر شاہ تخت اور مروارید خیمے وخرگاہ فوج کے ساتھ کیوں لایا تھا، اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے تمام جواہرات قلعے میں محفوظ کر دیے تھے۔

دوسرے مجمع التواریخ مولفہ مرزا محمد خلیل مرعشی اور مجمل التواریخ زندیہ میں تخت طاؤس کے متعلق دو ایسے بیانات ملتے ہیں جن سے پوری طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ نادر شاہ کے بعد بھی یہ تخت موجود تھا، اور اس کو کام میں لایا جاتا تھا،

مجمع التواریخ کا پہلا بیان شاہرخ افشار اور سید محمد کے ضمن میں ملتا ہے، ایک موقع پر سید محمد شاہرخ کو جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "جب ایک بے گناہ شخص بہبود خاں کے ساتھ جو تمھارے پاس دور دراز سے مشقتیں جھیل کر بیش قیمت تخت طاؤس لیکر آیا تھا، تم نے ایسا ناروا سلوک کیا تو کسی دوسرے شخص کے بارے میں تم سے کیا توقع کیجا سکتی ہے"، دوسرے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشہد میں سید محمد مذکور ۱۱۶۳ھ میں سلیمان شاہ ثانی کے نام سے تخت طاؤس پر جلوس آرا ہوا، صاحب مجمع التواریخ لکھتے ہیں "طلوع آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد محل سے نکل کر وہ تخت طاؤس پر رونق افروز ہوا...... تین شاہزادے بھی ..... اس کے حکم سے تخت کے دائیں جانب مرصع کرسیوں پر بیٹھے"۔ یہی بیان مجمل التواریخ زندیہ میں بھی ہے کہ "سہ شنبہ ۵ صفر المظفر ۱۱۶۳ھ کو عمارت الیاس خوانی میں طلوع صبح کے ایک گھنٹہ بعد وہ پورے جاہ و جلال اور تزک و احتشام کے ساتھ تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہوا، اور مسرت و شادمانی کے نقارے بجائے گئے"۔ لیکن ان تینوں بیانوں میں اسکی کوئی تصریح نہیں ہے کہ تخت طاؤس کہاں اور کس شخص کے پاس سے بہبود خاں دور دراز فاصلہ طے کر کے شاہرخ کے پاس لایا تھا،

کریم خاں زند کے متعلق معلوم ہے کہ اس نے اپنے کو بادشاہ کہلانا پسند نہیں کیا اور نہ کسی تخت حکومت پر وہ جلوس آرا ہوا، اس کی جو تصویریں موجود ہیں ان میں

بھی وہ کسی تخت پر تخت نشین نظر نہیں آتا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس جلوس آرائی
کے لائق کوئی تخت ہی نہ تھا، اس ہنگامہ کے زمانہ میں نادری جواہرات اور تخت طاؤس وغیرہ
شاہرخ کے پاس تھے، جن کی اس نے بڑی حفاظت کی، مگر آخر میں وہ سب اس کے ہاتھ
سے نکل گئے۔

اس لیے دورِ زندیہ اور اس کے بعد بھی تخت طاؤس اور تخت نادری کے متعلق
کوئی صریح اور صحیح اطلاع نہیں ملتی، اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے تخت طاؤس
کے انجام کے بارہ میں صرف ایک مبہم سی چیز سامنے آئی ہے، اوزن فلاندن اپنے
سفرنامہ میں لکھتا ہے "بیان کیا جاتا ہے کہ دہلی کی فتح کے بعد نادر شاہ کو جو خزانے ملے ان میں
مغلوں کا یہ گراں بہا تخت زیبا بھی تھا، جو نہایت قیمتی پتھروں سے مزین و آراستہ اور مور کے
پر کے مشابہ تھا، اس لیے اس کا نام تخت طاؤس رکھا گیا، اصفہان میں جہاں کشا (معلوم نہیں
جہاں کشا سے کون مراد ہے، نادر شاہ یا آغا محمد خاں) نے کہا کہ وہ الماس اور یاقوت سے
جڑے ہوئے تخت پر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں ہے، اس لیے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے فروخت
کر دیا گیا، مورخین لکھتے ہیں کہ "بیچنے سے اس کو وافر رقم ملی تھی"،

لیکن اس بیان کی صحت متیقن نہیں، اگر اس کو صحیح اور اس کا تعلق آغا محمد خاں سے
مانا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ قاجاری حکومت کے بانی نے اپنی حکومت کے زمانہ میں تخت کے
جواہرات ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے، لیکن اگر اس پر اعتماد نہ کیا جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ
حکومت کے انقلاب و تغیرات میں تخت طاؤس، تخت نادری اور دوسرے تختوں کا جن کو
نادر ہندوستان سے لایا تھا، کیا انجام ہوا،

لارڈ کرزن "مسئلۂ ایران و ایرانیان" میں تخت طاؤس کی سرگزشت کے متعلق

مختلف خیالات کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تہران کے درباریوں اور دوسرے اشخاص
سے جو تحقیقات ہو سکی ہیں ان کے مطابق آغا محمد خاں نے مشہد میں شاہرخ کو سزا دی اور
نادر شاہ کے تمام خزانے اور جواہرات اس سے لے لیے، ان میں دہلی کے تخت طاؤس
کے وہ ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے بھی تھے جو باقی رہ گئے تھے، بعد میں انکی مدد سے ایک نیا تخت بنایا گیا"
خلاصہ یہ ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز ہی سے اس تخت کا حال بالکل مفقود
ہے، نہ حکومتِ ایران کے جواہرات میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے اور نہ کسی اور تحریر
میں اس کا کوئی ذکر ہے، بجز اس کے کہ آغا محمد خاں کی تاجپوشی کے حالات بیان کرتے
ہوئے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ "تخت حکومت اور مسند سلطنت پر جلوہ فرما ہوا"،
لیکن یہ کونسا تخت ہے اور اس کا کیا نام تھا، اس کی کوئی تصریح نہیں، قصرِ سلیمانیہ
کے منقش پردہ پر جو دیوار میں آویزاں تھا، آغا محمد خاں اور اس کے حوالی کی تصویر
بنی ہوئی تھی، اس میں اس کو تخت طاؤس ہی کی طرح ایک تخت پر بیٹھا دکھایا گیا ہے
لیکن ہم کو یہ معلوم ہے کہ یہ پردہ بعد میں فتح علی شاہ کے زمانہ میں عبداللہ خاں نقاش نے
سلام شاہ آخر کی تصویر کی مدد سے بنایا تھا، اس لیے اس قسم کی خیالی تصویر پر نہ تو اعتماد
کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

قاجاری حکومت کے بانی آغا محمد خاں کے آخری اور اس کے جانشین فتح علی شاہ
کی حکومت کے شروع دور میں جب ایران میں ایک عرصہ کی بدنظمی کے بعد امن و امان
قائم ہوا اور مرکزی حکومت میں قوت و استحکام پیدا ہوا تو نادر شاہ کے خزانے اور
جواہرات اس کے جانشینوں اور خراسان کے کردوں اور امرا، وغیرہ سے حاصل کرکے تہران
میں سلطنت کے خزانہ میں جمع کیے گئے،

فتح علی شاہ کو کیانی اور ساسانی بادشاہوں کی طرح زربفت کپڑوں اور جواہرات سے آراستہ اسلحوں سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے ہاتھی دانت اور آبنوس کے مرصع اور زرنگار تخت پر جلوس کیا، کیانی تاج سر پر رکھا، خسروی پٹکہ کمر میں باندھا، شاہزادے عمدہ لباس میں مرصع تلواریں لیے ہوئے اس کے گرد حلقہ زن ہوئے، اور عمائد و ارکان سلطنت تخت کے سامنے کورنش بجا لائے۔

فتح علی شاہ نے اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیان نظام الدولہ حاجی محمد حسین خاں بیگلربیگی کے ہمراہ جو ۱۲۳۴ھ میں صدر اعظم کے عہدہ پر فائز اور صدر اصفہانی کے لقب سے مشہور ہوا، اصفہان کا سفر کیا اور حاجی محمد حسین کو حکم دیا کہ وہ اصفہان کے ماہرین فن زرگروں اور جواہر تراشوں سے ایک زرین مرصع تخت اس کے جلوس کے لیے تیار کرائے، اور سلطنت کے جواہرات اس میں استعمال کیے جائیں،

چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں اصفہان کے زرگر، جواہر تراش اور ماہر مینا کار حاجی محمد حسین خاں کی نگرانی میں تخت بنانے میں مشغول ہوئے اور ۱۲۱۶ھ میں نوروز سے پہلے یہ تخت بنکر تیار ہو گیا اور اس کو بادشاہ کے جلوس کے لیے اصفہان سے تہران لایا گیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حاجی محمد حسین خاں نے خود اپنے صرف سے تخت بنوا کر فتح علی شاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا، لیکن یہ غلط ہے۔

ابتداء میں یہ تخت تخت خورشید کے نام سے مشہور تھا کیونکہ اس کے تکیہ گاہ کے اوپر الماس سے مرصع سورج کا نقش نصب تھا، اس وقت خورشید کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہ تھا،

۱۲۱۶ھ میں نوروز کو فتح علی شاہ پوری شان و شوکت اور تجمل و آرائش کے ساتھ تخت خورشید پر رونق افروز ہوا، عمائد و ارکان حکومت کو اس نئے اور مرصع تخت کو دکھانے کے لیے شاہ نے دربار کیا، درباری شعرا نے اس موقع پر قصیدے کہے جن میں تخت خورشید اور بادشاہ کی مدح سرائی کی گئی تھی، فتح علی خاں صبا کا قصیدہ تہنیت سب سے زیادہ مشہور تھا، اس کے صلہ میں اس کو ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا،

فتح علی نے اپنی ایک منظور نظر طاؤس خانم کے جشن عروسی کے موقع پر جس سے اس کو بڑی فریفتگی تھی، اس کے نام کی نسبت سے تخت خورشید کا نام تخت طاؤس رکھدیا، اس کے بعد یہ نام اتنا مشہور ہوا کہ پرانا نام لوگوں کے ذہن سے بالکل فراموش ہو گیا، صرف کہیں کہیں یہ نام ملتا ہے، چنانچہ روضۃ الصفا ناصری مطبوعہ ۱۲۷۰ھ میں ۱۲۴۵ھ کے واقعات کے ضمن میں اس تخت کا نام طاؤس کے بجائے خورشید ہی لکھا ہے۔

ناصر الدین شاہ (۱۳۱۳ھ تا ۱۲۶۴ھ) نے جواہرات اور سلطنت کے دوسرے ساز و سامان کی حفاظت اور ان کی تزئین و آرائش میں بڑا اہتمام کیا، چنانچہ اپنی تخت نشینی کے دسویں سال ۱۲۷۴ھ میں اس نے مرزا عبد اللہ خاں نوری مستوفی کو فتح علی شاہ کے تخت خورشید میں ترمیم اور اس کو مزید جواہرات سے آراستہ و مزین کرنے کا حکم دیا، مستوفی نوری نے پایۂ تخت کے ماہر استادوں اور زرگروں کو جمع کر کے تخت کی پہلی شکل بالکل بدلوا دی اور اس کو پہلے سے زیادہ آراستہ کرایا، اس موقع پر تخت اور ناصر الدین شاہ کی مدح میں جو قصائد کہے گئے تھے ان کے اشعار بھی اس میں نقش کیے گئے۔

۱۲۹۵ھ اور ۱۲۹۶ھ کے درمیان ناصر الدین شاہ کے حکم سے ایک محل تعمیر کیا گیا اور

حکومت کے تمام زر و جواہر تاریخی اور نادر چیزیں ایرانی امرا اور دوسری حکومتوں کے بادشاہوں کے ہدایا و تحائف اس میں رکھ دیے گئے، تخت طاؤس کو بھی اس کی قدیم جگہ سے ہٹا کر یہیں تالار آئینہ میں منتقل کر دیا گیا، لیکن بعد میں یہاں سے بھی ہٹا کر تالار موزہ میں منتقل کر دیا گیا، اور وہ برسوں سے یہیں ہے۔

ناصر الدین شاہ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی جلوس، تاجپوشی، نوروز کی سلامی اور بعض دوسری تقریبات کے موقعوں پر تخت طاؤس کام میں لایا جاتا تھا، لیکن اعلیٰ حضرت رضا شاہ کے عہد میں یہ سلسلہ موقوف کر دیا گیا، یہاں تک کہ تاجپوشی کے موقع پر بھی انھوں نے اس تخت پر بیٹھنا پسند نہیں کیا، بلکہ ان کے حکم سے تاجپوشی کے لیے ایک چھوٹا سا تخت تیار کیا گیا جو تخت نادری کے نام سے مشہور ہے۔

تخت طاؤس کے جواہرات میں الماس، زمرد، یاقوت اور لعل کے کل ۴۵۲۷ ٹکڑے شامل ہیں، سرکاری کاغذات کے مطابق ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

الماس	۱۴۴۴
زمرد نو	۲۹۱
زمرد کہنہ	۱۱۴۰
لعل نو	۱۱
لعل کہنہ	۷۸۶
یاقوت	۸۵۵
میزان	۴۵۲۷

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مراکز المسلمین التعلیمیۃ والثقافیۃ والدینیۃ — مرتبہ مولانا عبد الحلیم ندوی استاذ ادب عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحو

قیمت و پتہ تحریر نہیں، غالباً مصنف کے پتہ یا مطبع نوری، مدراس-۱۳ سے ملے گی۔

ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و روایات کو زندہ رکھنے میں اسلامی اداروں کا بڑا حصہ ہے، اور آج بھی یہ چیزیں ان ہی کے دم سے زندہ ہیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں مسلمانوں کے ان تمام مذہبی، علمی و تعلیمی اداروں کے حالات عربی میں لکھے ہیں، تعلیمی اداروں میں دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، فرنگی محل لکھنؤ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ اور شیعہ اور بوہروں کی مشہور درسگاہوں کی مختصر تاریخ، ان کے مقاصد و خصوصیات تحریر کیے گئے ہیں، اور ان کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے، علمی و تصنیفی اداروں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین اور مکتبہ جامعہ دہلی، کتب خانوں میں رضا لائبریری رامپور اور خدا بخش لائبریری پٹنہ، تعلیمی تحریکوں میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش وغیرہ کی سرگذشت اور ان کی خدمات کا ذکر ہے، ان اداروں کی عمارتوں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں، آخر میں تصوف اور صوفیائے کرام کے روحانی فیوض

اور سلسلۂ چشتیہ و نقشبندیہ کے بعض اہم بزرگوں کے حالات و مناقب اور ان کے طریقۂ اصلاح و تربیت کا ذکر اور تبلیغی جماعت کے مقصد و طریقۂ کار کی وضاحت اور تقسیم ہند کے بعد اس کے کام کی وسعت و عمومیت کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، آخر میں چند عربی مدارس، کتب خانوں اور تحقیقی اداروں کے جن کے حالات صفحات کی تنگی کی وجہ سے نہیں لکھے جا سکے، صرف نام لکھ دیے گئے ہیں، اس طرح اس کتاب میں مسلمانوں کی علمی و تبلیغی تحریکوں اور ان سے متعلق اداروں کے حالات کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد کی ان کی ذہنی بیداری کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، انداز بیان بڑا متوازن اور غیر جانبدارانہ ہے، ہر ادارہ کو اس کے اصلی اور حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ مقام مسرت ہے کہ یہ مفید کام ندوہ کے ایک فرزند کے ہاتھوں انجام پایا۔

حقیقت روح انسانی ۔ مترجمہ مولانا مفتی محمد شاہ دین صاحب مرحوم تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲/۶۵ پیسے۔
پتہ: سنگ میل پبلیکیشنز ۳۲-اے شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔

یہ کتاب امام غزالی کے رسالہ "حل مسائل غامضہ" کا اردو ترجمہ ہے، امام صاحب نے اس میں روح اور واقعات بعد الموت کے متعلق بعض سوالات کے جوابات تحریر فرمائے ہیں، اس کے پہلے جز میں "فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی" (الآیہ) کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے تسویہ اور نفخ کا مفہوم، روح کی حقیقت، اس کا جسم سے تعلق، اس کے مخلوق اور امر ربانی ہونے کی تشریح کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں قبر و قیامت میں روح و جسم کا تعلق، میزان، حساب، شفاعت اور پل صراط کی حقیقت، ان پر اور خدا، فرشتوں، رسولوں اور روز آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت اور وجوہ تحریر کیے گئے ہیں

آخر میں جنت کی لذتوں کے حسی اور خواب میں خدا اور رسول کی زیارت کی حقیقت و نوعیت بیان کی گئی ہے، رسالہ کے مباحث دقیق و غامض ہیں اس لیے لائق مترجم مولانا مفتی محمد شاہ دین مرحوم پنجابی نے جو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھے، حواشی میں بعض اصطلاحات و مضامین اور مشکلات کی وضاحت و تشریح بھی کر دی ہے، یہ ترجمہ بہت پرانا ہے، اس لیے اس کی زبان بھی پرانی ہے، اگر ناشر نے اس کو سلیس بنا کر شائع کیا ہوتا اور پہلے جز میں ابواب و فصول قائم کر دیے ہوتے تو اس کا افادہ بڑھ جاتا،

نطق انور ۔ مرتبہ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، پتہ مکتبہ ناشر العلوم بخارہ روڈ، بجنور یو، پی،

یہ کتاب مولانا انور شاہ کشمیری مرحوم کے علمی ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ ہے، جن کو انکے ایک لائق شاگرد مولانا سید احمد رضا صاحب نے مرتب کیا ہے، اس میں ختم نبوت، سموات، جہنم و جنات، سزا و جزا، حیات انبیاء، امام اعظم اور محدثین، دار الکفر، دار الحرب اور دار الاسلام وغیرہ مختلف عنوانات کے تحت مولانا کے متفرق اقوال اور بعض بصیرت افروز تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات جمع کر کے ان پر تعلیقات لکھے گئے ہیں، ان تعلیقات میں مولانا انور شاہ کے فرمودات کی دوسرے اہل علم خصوصاً اکابر دیوبند کی رایوں سے مطابقت اور بعض مسائل کی مزید تحقیق و تشریح کی گئی ہے، مولانا نے موجودہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں سموات و جنات و جہنم کی بعض چیزوں کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، امام اعظم اور محدثین کے زیر عنوان انھوں نے امام اعظمؒ کے متعلق محدثین کے جس لب و لہجہ کی مذمت کی ہے وہی لب و لہجہ محدثین کے بارہ میں ان کا ہو گیا ہے، کتاب کی

ترتیب میں بھی بے ربطی ہے، اور مولانا کے ملفوظات اور مرتب کی تشریحات خلط ملط ہوگئی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مولانا انورشاہ کی ذہانت و فطانت علم و فضل اور ناقدانہ و مبصرانہ نظر کا نمونہ اور تفسیر و حدیث، فقہ و کلام اور تصوف وغیرہ کے بعض اہم فوائد و نکات اور بعض علمی و اعتقادی مسائل کی تشریح پر مشتمل ہے، شروع میں لائق مرتب نے مولانا کی جامعیت، ابتکار اور علمی کمالات کا تذکرہ بھی تحریر کیا ہے۔

"ض"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت ... ... دارالمصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت ... ... ماہانہ

نام پرنٹر ... ... صدیق احمد

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... دارالمصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر ... ... " " "

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... دارالمصنفین اعظم گڈھ

نام اڈیٹر ... ... شاہ معین الدین احمد ندوی

قومیت ... ... ہندوستانی

پتہ ... ... دارالمصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ " " "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

جلد ۱۰۱ - ماہ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۸ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات